ماہنامہ
صراطِ مستقیم
برمنگھم
March 2022

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

صراطِ مستقیم برمنگھم

بیاد

مولانا فضل کریم عاصم رحمہ اللہ

مولانا محمود احمد میرپوری رحمہ اللہ

Vol: 42 No. 05 March 2022

Rajab/ Shaban 1443 AH

جلد: 42 شمارہ: 05 مارچ 2022ء

رجب/شعبان 1443ھ

فہرست مضامین

Correspondence Address:

SIRAT-E-MUSTAQEEM

20 Green Lane, Small Heath,

Birmingham B9 5DB

Tel: 0121 773 0019

Fax: 0121 766 8779

ناشر: مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ

Markazi Jamiat Ahl-e-Hadith UK

www.mjah.org.uk/siratemustaqeem

E-mail: info@mjah.org.uk

(نوٹ: ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

ماہِ فروری 2022ء جنوبی ہند کے صوبہ کرناٹک میں واقع مہاتما گاندھی اور ڈپی کالج میں پیش آنے والے واقعہ پر مقامی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعہ اظہارِ خیال اور ردِ عمل کا سلسلہ زور وشور سے جاری ہے۔ انگریزی اور عربی اخبارات نے نمایاں طور پر یہ خبر شائع کی۔

مسکان خان جو B.Com سال دوم کی طالبہ ہیں، اپنے روایتی لباس برقعہ میں ملبوس کالج پہنچیں تو کچھ شر پسند عناصر نے کالج کے مرکزی دروازہ پر انہیں روکتے ہوئے برقعہ اتارنے کا مطالبہ کیا، لیکن مس خانم نے ہمت وحوصلہ سے کام لیتے ہوئے موٹر سائیکل پر سوار کسی طرح کالج کے احاطہ میں داخل ہو گئیں اور گاڑی مختص جگہ پارک کی، اتنے میں وہی اوباش لوگوں کی بھیڑ کا تعاقب کرتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئی جو زعفرانی گیروئے رنگ کے مفلر ڈالے ہوئے تھے اور زور زور سے نعرے بلند کر رہے تھے:

"جئے شری رام"

لیکن مس خانم نے جرأت سے آگے بڑھتے ہوئے نعرہ تکبیر اللہ أکبر بلند کی، وہ اکیلی تھیں ان کے تعاقب میں ایک بھیڑ تھی، وہ عورت ہیں، ان کے خلاف مردوں کا جتھا تھا، جو کسی بھی قسم کی پُر تشدد کاروائی کر سکتے تھے، ایسے متعدد واقعات ہو چکے ہیں، لیکن شر پسندوں کے ہجوم اور نعروں کی پرواہ کیے بغیر مس خانم بھی اللہ أکبر کا نعرہ لگاتی رہیں، عام دینی محفلوں میں یا اپنے مخصوص اجتماعات میں نعرہ لگانا اور ہے، مخالفین کے ہجوم میں گھرے ہونے کے باوجود یہ نعرہ بلند کرنے میں بڑا فرق ہے۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور

کالج انتظامیہ نے بروقت ان کی مدد کی، وہ اپنے برقعہ کے ساتھ کالج کی اندرونی عمارت میں داخل ہو گئیں۔ یہاں کچھ پہلو غور طلب ہیں، ان کے لباس پر پابندی نہ کالج انتظامیہ کی طرف سے لگائی گئی تھی، اور نہ ہی قانونی طور پر کس ادارہ کی جانب سے، بلکہ کالج لیکچرز نے ان کی مدد کی، نیز وہ پہلی مرتبہ اس لباس میں نہیں آئی تھیں، وہ اسی کالج کے سال دوم میں زیر تعلیم ہیں، یہ ان کے لیے معمول کا لباس ہے، اچانک ان کے برقعہ پر اعتراض کیوں کیا گیا!

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ ان کے لباس پر اعتراض کر رہے تھے کہ اس سے طلبہ میں یکسانیت اور یونیفارم کے اصولوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے، وہ خود مخصوص رنگ کے مفلر ڈالے ہوئے تھے۔ جو ہندوؤں کا مذہبی رنگ اور ایک سیاسی پارٹی کی شناخت سمجھا جاتا ہے، یہ دراصل اس تعصب اور نفرت کے بیج کے برگ وبار ہیں جو حکمران پارٹی نے انتخابات جیتنے کے لیے بوئے تھے، اس کی ڈالیاں اب مختلف اداروں اور شعبہ ہائے زندگی میں پھیل چکی ہیں، ملک بھر میں اس کے زہریلے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں، جب ضرورت پڑتی ہے، ان زہریلی شاخوں کو ہوا دی جاتی ہے۔ یورپی ممالک کو جمہوری اقدار، اظہار خیال اور انسانی آزادی پر ناز ہے، مگر حجاب کے مسئلہ میں مزعومہ اقدار اور دعوے ہچکولے کھاتے نظر آئیں گے۔ فرانس نے پہلے نقاب پر پابندی عائد کی، اس کی اقتدا میں مختلف مغربی ممالک میں یہی قدم اٹھایا گیا۔ برطانوی وزیر اعظم نے اس کے لیے کریہہ تشبیہ دی، نقاب پوش خواتین لیٹر بکس کی طرح دکھائی دیتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ اس سوقیانہ ریمارکس پر انہیں پارلیمنٹ میں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا، بلجیئم، اٹلی اور ہالینڈ وغیرہ میں عوامی مقامات پر نقاب پر نہ صرف پابندی لگائی گئی بلکہ اس کے خلاف جرمانہ بھی مقرر کیا گیا، اگرچیکہ مخالفتوں کے طوفان میں اٹلی کے اہم رہنما، روبرٹ بیروں نے دفاع کرتے ہوئے کہا کہ ہم نقاب پر پابندی کے قانون کی کیسے حمایت کر سکتے ہیں، جب ہم حضرت مریم علیہا السلام کے مجسموں پر خود حجاب دیکھتے ہیں۔

یاد رہے کہ نصاریٰ کی مذہبی عورتوں میں ساتر لباس اور سر ڈھانکنے کا عام رواج ہے، خصوصاً ننس کو اسی لباس کے ذریعہ پہنچانا جاتا ہے۔

ایسے ہی صوبہ کرناٹک میں پیش آنے والے مذکورہ واقعہ کے خلاف بہت سے غیر مسلموں نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا اور کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ دراصل سیاسی انتخابات جیتنے کے حربے ہیں، شمالی ہند میں آج کل انتخابات ہو رہے ہیں اور اس سے پہلے فضا ایسی مسموم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ برسہا برس سے اکٹھے زندگی گذارنے والے بھی ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگیں، پھر یہ تلخیاں صرف انتخابات تک محدود نہیں بلکہ پُر امن ماحول کو دیر تک مکدر کرنے کا سبب بنتی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ حجاب کیا عورت کے لیے کلچر کا حصہ ہے یا اسلامی حکم! اسلام نے مردوں اور عورتوں کے لیے اپنی نگاہوں کی حفاظت کا

حکم دیا ہے، دونوں کے لیے کچھ آداب متعین کیے۔ جن کی تفصیلات سورہ نور آیات 30، 31 اور سورۃ الاحزاب آیت 58 وغیرہ اور صحیح احادیث میں دیکھی جا سکتی ہیں، لہٰذا یہ شریعت کا حکم ہے، جس کی پاسداری ہر کلمہ گو مسلمان پر ضروری ہے، چاہے اس کا کلچر یا جغرافیائی پس منظر کوئی بھی ہو اور اللہ عزوجل کا کوئی قانون ہمارے لیے نقصان دہ نہیں بلکہ خالق کائنات کا ہر قانون ہمارے لیے فائدہ مند ہے، بظاہر برقعہ یا نقاب کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے لیکن اس کپڑے میں اتنا رعب ہے کہ

مخالفین اسلام کے دل ڈوبنے لگتے ہیں اور ان پر انجانہ خوف اور ہیبت سی طاری ہونے لگتی ہے تب یہی تو نقاب اور کبھی حجاب سے نجات میں ہی انہیں اپنی عافیت محسوس ہوتی ہے، یا اسی کپڑے کے ٹکڑے کو اسلامی اقدار کی بقاء کی نشانی اور انقلاب کا پیش خیمہ سمجھنے لگتے ہیں۔

کورونا کے زمانہ میں حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے سب ہی کو اپنی سلامتی کے لیے اس کی افادیت کا قائل ہونا پڑا، گویا وائرس نے یہ سبق بھی دیا کہ حجاب شخصی سلامتی اور حفاظت کا مؤثر ذریعہ ہے، لیکن پردہ بعض لوگوں کے لیے اتنا مشکل اور آزمائشی حکم ہے کہ بہت سے اسلام کے دعویداروں کی ہمت جواب دینے لگتی ہے۔

اسی مسئلہ پر ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا مشہور سلسلہ درس قرآن پاکستانی ٹی وی کو ختم کرنا پڑا، حجاب کے خلاف پاکستان میں ایک تحریک شروع کی گئی، میرا جسم میری مرضی، جو کہ دینی، اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے پاکستان میں اجنبی نعرہ تھا لیکن وہاں کی بعض تعلیم یافتہ اور فیشن کی دلدادہ خواتین کی تائید نے اس بیگانہ نعرہ کو توانائی فراہم کی، پھر بعض سرکاری ذمہ داروں نے ان کے حق میں بھرپور وکالت کی۔

مس خانم کے واقعہ کے بعد سوشل میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا پر حجاب کے مسئلہ میں گرما گرم بحث کا سلسلہ جاری ہے، مختلف لوگ اس اہم مسئلہ پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے چند خاص اصطلاحات کا بے دریغ استعمال کر رہے ہیں، برقعہ نقاب، حجاب خصوصاً ان کے نشانہ پر ہے، ان اصطلاحات میں کچھ دانشور بھی مغالطہ کا شکار ہیں، اس لیے ان کا صحیح مفہوم ذہن میں ہونا ضروری ہے۔

حجاب: پردہ کرنے کو کہتے ہیں، یعنی خاتون کے اس فعل کا نام حجاب ہے، جب وہ کسی غیر محرم کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اختیار کرتی ہے، جیسے دیوار یا دروازہ کے پیچھے سے مخاطب ہو، سورۃ الاحزاب آیت 53 میں حکم دیا گیا کہ امہات المؤمنین سے بھی کوئی چیز مانگنی ہو تو حجاب یعنی پردہ کی آڑ سے مانگو، عرف عام میں یہی لفظ عام ہو گیا۔

برقعہ: ایسی چادر، کوٹ یا گون جو عورت کے گھریلو کپڑوں کو ڈھانک دے، اس کا اصطلاحی نام جلباب ہے، اس کے لیے نہ مخصوص رنگ کی شرط ہے کہ وہ سیاہ رنگ کا ہو اور نہ ہی اس کی طرز سلوائی، اہمیت رکھتی ہے کہ اس کی ٹیلرنگ کس شکل کی ہو، البتہ وہ بجائے خود سادہ ہو کیونکہ مقصد گھریلو کپڑوں اور زیب وزینت کو چھپانا ہے، اس کی مروجہ شکل برقعہ ہے کہ اس کا پہنا اور سنبھالنا نسبتاً آسان ہوتا ہے، اس لیے خواتین اس کو ترجیح دیتی ہیں۔

نقاب: چہرہ کو ڈھانکنے کے لیے لمبا گھونگٹ یا اضافی کپڑا جو سر سے ایسے لٹکایا جائے کہ چہرہ چھپ جائے۔

عموماً اعتراض نقاب پر ہی کیا جاتا ہے، حجاب یا برقعہ ضمناً اس کی لپیٹ میں آ گیا، ورنہ نقاب پر ہی بنیادی اعتراض ہے، خصوصاً ایسی نقاب پوش خواتین اگر عوامی مقامات پر دکھائیں دیں، نقاب کے حکم پر اہل علم کی آراء مختلف ہیں:

علامہ الشیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ اس مسئلہ پر نہایت اہم علمی کتاب لکھی 'جلباب المرأۃ المسلمۃ' اس میں دلائل کا بے لاگ تجزیہ کرنے کے بعد جو رائے دی، وہ اس مسئلہ میں متوازن اور عملی ہے۔

خواتین کی تربیت کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے جسم اور زیبائش کو پردہ میں چھپائے بغیر باہر نہ نکلیں، سوائے چہرہ اور ہتھیلیوں کے، اگرچیکہ وہ بھی چھپائیں تو بہت مناسب ہے، میں نے اپنی بیوی اور بیٹیوں کے لیے یہی اسلوب اختیار کیا ہے، لیکن چہرہ کو چھپانا واجب نہیں، اسے بہتر اور مناسب کہا جائے گا، کیونکہ کسی چیز کو واجب کہنے کے لیے اتنی ہی صریح اور صحیح دلیل بھی چاہیے۔ ورنہ بلا دلیل کے دین میں غلو کے مترادف ہوگا کہ

ہم چہرہ کے نقاب کو واجب کہیں اور غلو ہی بعض قوموں کی تباہی کا سبب بنا۔

خصوصاً اس وقت جب کہ بے پردگی اور اباحیت کا دور دورہ ہے، بیشتر عرب ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آ چکے ہیں، بلکہ اس وقت تو اکثر مغربی ممالک میں نقاب کے خلاف قانون ہے، خلاف ورزی پر پولیس کو حق حاصل ہے کہ وہ جرمانہ کر دیں اور پولیس اس پر عمل بھی کر رہی ہے۔

لہٰذا خواتین کو چاہیے کہ جہاں ممکن ہو وہاں چہرہ کو ڈھانکیں، سوائے ضروری حالات اور مقامات کے وہاں نقاب پر اصرار نہ کریں، مگر ہر صورت میں بغیر میک اپ اور سادگی کو اپنائیں۔

☆☆☆

دین کی عمارت

دین کی عمارت دو بنیادوں پر استوار ہے:

1۔ ذکر 2۔ شکر

(حافظ ابن قیم رحمہ اللہ)

پہلا خطبہ:

ہر طرح کی حمد و ثنا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو صفات کمال وجلال سے متصف ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ واحد، سب سے بڑا اور سب سے بلند ہے۔ میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اے اللہ! رحمتیں سلامتیاں اور برکتیں نازل فرما آپ ﷺ پر اور آپ کے اہل بیت پر۔

بعد ازاں! اے مسلمانو! میں اپنے آپ کو اور آپ سب کو اللہ سے ڈرنے کی تلقین کرتا ہوں۔

اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (سورۃ البقرۃ:197)

”زاد راہ حاصل کر لو، اور سب سے بہتر زاد راہ پرہیز گاری ہے پس اے ہوش مندو! میری نافرمانی سے پرہیز کرو۔“

اللہ کے بندو! ماہِ شعبان ایک فضیلت والا مہینہ ہے۔ دوسرے مہینوں کی طرح اس کے اوقات کو بھی اللہ کی فرمان برداری اور شریعت پر استقامت سے معمور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے، مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔“ (سورۃ آل عمران:102)

اللہ کے بندو! وقت کو غنیمت جانو، اللہ کو راضی کرنے کے لیے پھیرتیلا پن دکھاؤ۔ یاد رکھو کہ رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ ہے۔

آپ ﷺ کا ماہِ شعبان کا بیشتر حصہ روزے میں گزار دیتے تھے۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں:

«مَا رَأَيْتُهُ أَكْثَرَ صِيَامًا مِنْهُ فِي شَعْبَانَ»

”میں نے آپ ﷺ کو کسی اور مہینے میں شعبان جتنے روزے نہیں رکھتے دیکھا۔“ (صحیح بخاری)

صحیح مسلم میں ہے:

«كان يَصومُ شَعبانَ كُلَّه إلّا قَليلاً »

”آپ ﷺ شعبان کے تھوڑے سے حصے کے علاوہ شعبان کو روزوں میں گزارتے تھے۔“

سلفِ صالحین اس مہینے کو قراء کا مہینہ کہتے تھے، کیونکہ اس میں قراءِ حضرات کثرت سے تلاوت کرتے تھے اور قرآن کریم کو دہرانے کے لیے وقت نکالتے تھے۔

تو اللہ آپ کی نگہبانی فرمائے! اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرو، ہر طرح کی عبادت کرو، خیر کے ان کاموں میں پیش قدمی کرو جو قرآن کریم اور سنت رسول میں آئے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، عمرہ، صدقہ، احسان اور کثرتِ تلاوت قرآن۔ وہ نیکیاں بھی کرو جن سے دوسرے مسلمان مستفید ہوتے ہیں، ضرورت مند اور محتاج فائدہ اٹھاتے ہیں اور جن میں اللہ رب العالمین کا قرب بھی نصیب ہوتا ہے۔

عَنْ أُسَامَةَ بْنُ زَيْدٍ، قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ لَمْ أَرَكَ تَصُومُ شَهْرًا مِنَ الشُّهُورِ مَا تَصُومُ مِنْ شَعْبَانَ . قَالَ " ذَلِكَ شَهْرٌ يَغْفُلُ النَّاسُ عَنْهُ بَيْنَ رَجَبٍ وَرَمَضَانَ وَهُوَ شَهْرٌ تُرْفَعُ فِيهِ الأَعْمَالُ إِلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ فَأُحِبُّ أَنْ يُرْفَعَ عَمَلِي وَأَنَا صَائِمٌ

سیدنا اسامہ بن زید ؓ نے بیان کیا: میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ اس مہینے میں دوسرے مہینوں سے زیادہ روزے کیوں رکھتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیونکہ اکثر لوگ اس مہینے سے غافل رہتے ہیں، حالانکہ اسی میں لوگوں کے کام پروردگارِ عالم کی طرف اٹھائے جاتے ہیں اور مجھے اچھا لگتا ہے کہ جب میرے کام پیش ہوں، تو میں روزے سے ہوں۔

مسلمان کو اپنی ساری زندگی اسی طریقے پر گزارنی چاہیے۔

جہاں تک اُس حدیث کی بات ہے جو سنن ابی داؤد اور سنن نسائی میں آئی ہے کہ

« إِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلا تَصُومُوا »

”جب شعبان کا آدھا حصہ گزر جائے تو روزے نہ رکھا کرو۔“

تو اکثر اہلِ علم اس حدیث کو ضعیف سمجھتے ہیں۔ بیان کرتے ہیں:

”یہ حدیث سند اور متن کے لحاظ سے منکر ہے۔“

جنہوں نے اسے صحیح سمجھا ہے انہوں نے بھی کہا ہے کہ یہ حدیث اس شخص کے بارے میں ہے جس کے معمول میں کوئی روزے نہ ہوں بلکہ وہ شعبان کے آخری حصے میں اس احتیاط کے لیے روزے شروع کر دے کہ کہیں رمضان شروع نہ ہو گیا ہو۔ تو اللہ آپ کی نگہبانی فرمائے، نیکیوں کی دوڑ میں آگے نکلو، وقت کا فائدہ اٹھاؤ، اسے نیکیاں اور قربِ الٰہی کمانے میں لگاؤ۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ

عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ﴾

”دوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اور وہ اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی۔“(سورۃ آل عمران:133)

جو باتیں ہم نے سنی ہیں، اللہ مجھے اور آپ کو ان سے برکت دے۔ میں اللہ سے اپنے لیے، آپ کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے ہر گناہ کی معافی مانگتا ہوں۔ آپ بھی اسی سے معافی مانگو۔ یقیناً! وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

دوسرا خطبہ

اللہ تعالیٰ کے لیے بے انتہا تعریف ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

بعد ازاں! اے مسلمانو!

ایک اہم اصول اور بڑا قاعدہ یہ ہے کہ اسلام میں بدعت ایجاد کرنا حرام ہے۔ اللہ کی عبادت اس کے فرامین اور رسول اللہ ﷺ کے طریقے کے مطابق ہونی چاہیے۔ اللہ آپ کو توفیق دے، یاد رکھو کہ نصفِ شعبان کی رات میں خصوصی طور پر تہجد پڑھنا یا اس کے دن میں روزہ رکھنا ایسا کام ہے جس کی کوئی قابل اعتبار دلیل نہیں ہے۔ بلکہ تمام مسلکوں کے فقہاء نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ یہ کام بدعت ہے۔

اس حوالے سے ایک روایت آتی ہے جسے بعض اہل علم نے حسن کہا ہے کہ

اللہ جل وعلا نصفِ شعبان کی رات میں اپنے بندوں کو دیکھتا ہے، مشرکین اور کدورتیں پالنے والوں کے علاوہ تمام اہلِ زمین کو بخش دیتا ہے۔ تو اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو بھی اس میں نصفِ شعبان کی رات میں کوئی خاص عبادت کرنے کا حکم نہیں ہے۔

رہی بات ان محفلوں کی جو بعض معاشروں میں رواج پا گئی ہیں، جن میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور طرح طرح کے کھانے کھاتے ہیں، جنہیں "شعبہ" کے نام بھی جانا جاتا ہے۔ تو اگر ان محفلوں کا مقصد عبادت اور قربِ الٰہی کمانا ہو، تو یہ ایک بدترین بدعت اور ناجائز ہیں۔

تو اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو، بدعتوں سے بچو۔ یہ سراسر برائی ہیں۔ یہ اس سنت سے ہٹی ہوئی ہیں جو ہمارے دین کی بنیاد اور وہ ایسا اصول ہے کہ جس سے ہٹی ہوئی کوئی عبادت قبول نہیں ہوتی۔

مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسا حکم دیا ہے جس سے ہماری زندگیوں کا پاکیزگی ملتی ہے اور آخرت سنورتی ہے۔ یہ حکم ہمارے رسول ﷺ پر درود وسلام بھیجنے کا حکم ہے۔ اے اللہ! رحمتیں، برکتیں اور سلامتی نازل فرما آپ ﷺ پر، آپ ﷺ کے اہل بیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر۔

اے اللہ! ہم پر اور ہمارے کمزوروں پر رحم فرما۔ ہماری ہر بات کا خاتمہ اسی پر ہے کہ ساری تعریف اللہ ربّ العالمین ہی کے لیے ہے، اور درود وسلام ہیں نبی کریم ﷺ پر۔

☆☆☆

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الجواب الکافی میں مراسیلِ امام حسن بصری رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ

”خدا جب کسی قوم سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے معاملات حلیم اور بردبار لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے اور اسے فراخ دل اور سخی لوگوں کے ماتحت کر دیتا ہے؛ اور جب وہ کسی قوم سے شر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے امور بے وقوف لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور اسے بخیلوں کی ماتحتی میں دے دیتا ہے!“

ظفر اقبال کی اہلیہ انتقال کر گئیں

جو بھی اس دنیا میں آئے ہیں ان کو ایک دن اللہ کے حکم سے جانا ہے لیکن بعض جانے والوں کی یادوں کو آسانی سے بھلا نہیں پاتے ہیں، ان ہی نیک لوگوں میں ڈڈلی کی ایک نیک وصالحہ خاتون ظفر اقبال جنجوعہ کی اہلیہ محترمہ تھیں جو اچانک داغ مفارقت دے گئیں۔

إنا لله وإنا إليه راجعون، إنا لله ما أخذ وله ما أعطى وكل شيئ عنده بأجل مسمى، فلتصبر ولتحتسب

مرحومہ کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں، بڑے بیٹے حافظ اکرام ظفر جنجوعہ نے ماں کی نماز جنازہ پڑھائی، نماز سے قبل ڈاکٹر حافظ محمد عارف المکاوی اور ڈاکٹر عبد الرب ثاقب نے موت کے تعلق سے اور اس مرحومہ بہن کی خوبیوں اور نیکیوں کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ہر خیر کے کاموں میں یہ بھی آگے ہوتیں اور کثرت سے قرآن حکیم کی تلاوت کرتی تھیں، ان کے شوہر نامدار اور بچے بچیاں بھی نیک ہیں۔

اسی طرح ان سے چند دن پہلے باجی کی ایک رشتہ دار اور ان کی سہیلی زوجہ جناب محمد یوسف جنجوعہ بھی داغ مفارقت دی گئیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل بخشے۔ آمین

دعا ہے کہ اللہ کریم محترمہ برکت بی بی کو جنت الفردوس میں داخل فرمائے اور ان کے پسماندگان اور متعلقین کو صبر جمیل بخشے، آمین۔

سچ ہے جانے والے کبھی نہیں آتے، جانے والوں کی یاد آتی ہے۔

☆☆☆☆

مخلوقِ خدا کا ایک دوسرے کے ساتھ رحم وکرم کا رویّہ

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:

«جَعَلَ اللهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ، فَأَمْسَكَ عِنْدَهُ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ، وَأَنْزَلَ فِي الْأَرْضِ جُزْءًا وَاحِدًا، فَمِنْ ذَلِكَ الْجُزْءِ يَتَرَاحَمُ الْخَلْقُ حَتَّى تَرْفَعَ الْفَرَسُ رِجْلَهَا عَنْ وَلَدِهَا خَشْيَةَ أَنْ تُصِيبَهُ.»

(صحيح بخاری، كتاب الأدب، باب جعل الله الرحمة مائة جزء، ح: 6000-صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى وأنها سبقت غضبه، ح:2752)

"اللہ تعالیٰ نے رحمت کے 100 حصے بنائے ہیں، 99 حصوں کو اپنے پاس رکھا ہے اور ایک حصے کو زمین پہ اتارا ہے، چنانچہ مخلوقِ خدا کا باہم رحم وکرم سے پیش آنا (بلکہ) یہاں تک کہ گھوڑا جو اس ڈر سے اپنے بچے سے اپنی ٹانگ کو اٹھائے رکھتا ہے کہ کہیں اس کی ٹانگ اس کے بچے کو نہ کچل دے، یہ سب رحمت کے اسی ایک حصے سے ہے۔"

مذکورہ حدیث میں اللہ کی رحمت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سو حصوں میں سے اس نے صرف ایک حصہ زمین پر اتارا ہے اور تمام مخلوقِ خدا، خواہ وہ جن وانس ہوں یا چرند وپرند، وہ سب آپس میں جو رحم وکرم سے پیش آتے ہیں وہ صرف اس ایک حصے کے بدولت ہے، حتیٰ کہ ایک گھوڑا اگر کھڑا ہو اور نیچے اس کا بچہ بیٹھا ہو اور گھوڑے کی وہ ٹانگ جو اس کے بچے کی طرف ہوتی ہے وہ اسے صرف اس خدشے کے باعث اوپر اٹھائے رکھتا ہے کہ اگر وہ زمین پر رکھے گا تو کہیں اس کا بچہ نیچے آکر کچلا ہی نہ جائے۔ تو فرمایا کہ گھوڑے کی یہ محبت بھی رحمتِ الٰہی کے اسی ایک حصے میں سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اندازہ کیجیے کہ باقی 99 حصے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھے ہیں تو اس کی رحمت کا کیا عالم ہو گا اور وہ کس درجہ مہربان ہو گا؟

سیدنا جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:

«لَا يَرْحَمُ اللهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ»

(صحيح بخاری، كتاب التوحيد، باب قول الله تبارك وتعالى: ﴿قُلِ ادْعُوْا اللهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ أَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْأَسماء الحسنى﴾، ح: 7376-صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب رحمته ﷺ الصبيان والعيال وتواضعه وفضل ذلك، ح: 2316)

"اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر رحم نہیں فرماتا جو لوگوں پر رحم نہ کرتا ہو۔"

سیدنا جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ لَا يَرْحَمُهُ اللهُ»

(صحيح بخاری، كتاب التوحيد، باب قول الله تبارك وتعالى: ﴿قل ادعوا الله أو ادعوا الرحمن أيا ما تدعوا فله الأسماء الحسنى﴾، ح: 7376- صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب رحمته ﷺ الصبيان والعيال وتواضعه وفضل ذلك، ح: 2316)

"جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ بھی اس پر رحم نہیں فرماتا۔"

سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، ارْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ»

(سنن أبوداؤد، كتاب الأدب، باب في الرحمة، ح: 4941- سنن ترمذی، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في رحمة المسلمين، ح: 1924- صحيح الجامع للألباني: 7467)

"رحم کرنے والوں پر رحمان (عزوجل) رحم فرماتا ہے، سو تم زمین والوں پر رحم کیا کرو تم پر آسمان والا رحم فرمائے گا۔"

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ رحمتِ الٰہی کا مستحق بننے کے لیے مخلوقِ خدا پر رحم کرنا ضروری ہے اور جو اس کا اہتمام نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کے رحم کا حقدار نہیں ٹھہرتا۔

سیدنا عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلَاثَةٌ: ذُو سُلْطَانٍ مُقْتَصِدٌ مُتَصَدِّقٌ مُوَفَّقٌ، وَرَجُلٌ رَحِيمٌ رَقِيقُ الْقَلْبِ بِكُلِّ ذِي قُرْبَى وَمُسْلِمٍ، وَفَقِيرٌ عَفِيفٌ مُتَصَدِّقٌ»

(صحيح مسلم، كتاب صفة الجنة، باب الصفات التي يعرف بها في الدنيا أهل الجنة وأهل النار، ح: 2865)

"جنّتی لوگ تین طرح کے ہوں گے: (پہلا) ایسا صاحبِ سلطنت شخص کہ جو میانہ رو ہو، صدقہ وخیرات کرنے والا ہو اور (بھلائی) کی توفیق سے نوازا گیا ہو، (دوسرا) وہ مہربان شخص جو ہر قرابت دار اور ہر مسلمان کے لیے نرم دِل ہو اور (تیسرا) وہ غریب شخص جو (لوگوں سے مانگنے) سے بچتا ہوا اور (حتی الوسعت) صدقہ وخیرات کرتا ہو۔"

گویا وہ شخص بھی جنت کا حقدار ہے جو لوگوں کے لیے اپنے دِل میں نرم گوشہ رکھتا ہے اور پھر اس کا یہ رویّہ بلا تفریق ہوتا ہے، یعنی خواہ اس کا کوئی قرابت دار ہو یا غیر ہو، سب کے ساتھ اس کا سلوک رحم وکرم کا ہوتا ہے۔

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَوَاصُلِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ، إِذَا اشْتَكَى عُضْوٌ مِنْهُ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالْحُمَّى وَالسَّهَرِ.»

(صحيح بخاری، كتاب الأدب، باب قتل الولد خشية أن يأكل معه، ح:6011-صحيح مسلم، كتاب البروالصلة، باب تراحم المؤمنين وتعاطفهم وتعاضدهم، ح: 2586)

”مسلمانوں کا آپس میں رحم و کرم، محبت و مودّت اور میل جول کا معاملہ ایک جسم کے مانند ہے، جب اس کے جسم کا ایک عضو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی کے ساتھ اس کی تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے۔“

یعنی جس طرح جسم کے ایک عضو میں تکلیف ہونے سے سارا جسم بے آرام و بے سکون ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کے دُکھ، تکلیف اور کسی بھی قسم کی پریشانی میں مبتلا ہو جانے سے تمام مسلمانوں کو بے چین ہو جانا چاہیے اور اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اس کے دُکھ، درد اور پریشانی کا مداوا کرنا چاہیے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے صادق و مصدوق ابو القاسم ﷺ کو فرماتے سنا:

«لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ إِلَّا مِنْ شَقِيٍّ.»

(سنن أبوداؤد، كتاب الأدب، باب في الرحمة، ح: 4942-سنن ترمذی، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في رحمة المسلمين، ح: 1923-مسند أحمد: 301/2)

”رحمت و شفقت سوائے بدبخت کے کسی سے نہیں چھینی جاتی۔“

یعنی جو کسی پر رحم اور شفقت نہیں کرتا وہ بدبخت شخص ہے، اور اس بدبختی کو دُور کرنے اور سعادت مندی سے بہرہ مند ہونے کے لیے دِل کو مہربان کرنا ضروری ہے۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَدْخُلُ فِي الصَّلَاةِ أُرِيدُ إِطَالَتَهَا فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَأَخْفِفُ مِمَّا أَعْلَمُ مِنْ شِدَّةِ وَجْدِ أُمِّهِ بِهِ»

(صحيح بخاری، كتاب الأذان، باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبي، ح: 709-صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، ح: 470)

”میں نماز شروع کرتا ہوں تو لمبی نماز پڑھنے کا ارادہ کرتا ہوں، لیکن جب کسی بچے کے رونے کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے تو میں اس بچے کی ماں کو اس کے باعث ہونے والی سخت بے چینی کو جان کر اس کی وجہ سے نماز مختصر کر دیتا ہوں۔“

یعنی آپ ﷺ کے دِل میں رحم اور شفقت اس قدر تھی کہ ایک ماں کا اپنے بچے کی وجہ سے بے چین ہو جانا بھی آپ ﷺ پر گراں گزرتا تھا اور اس کی خاطر آپ ﷺ نماز کو مختصر فرما دیتے تھے جو کہ بندگیٔ الٰہی کا عالی ترین مظہر ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«بَيْنَمَا رَجُلٌ فِي طَرِيقٍ أَصَابَهُ عَطَشٌ فَجَاءَ بِئْرًا، فَنَزَلَ فَشَرِبَ ثُمَّ خَرَجَ، فَإِذَا كَلْبٌ يَأْكُلُ الثَّرَى مِنَ الْعَطَشِ، فَنَزَلَ الرَّجُلُ إِلَى الْبِئْرِ فَمَلَأَ خُفَّهُ مِنَ الْمَاءِ ثُمَّ أَمْسَكَ الْخُفَّ بِفِيهِ فَسَقَى الْكَلْبَ، فَشَكَرَ اللهُ لَهُ فَغَفَرَ لَهُ». فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! وَإِنَّ لَنَا فِي الْبَهَائِمِ أَجْرًا؟ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «فِي كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ حَرَّى أَجْرٌ.»

(صحيح بخاری، كتاب المساقاة، باب فضل سقي الماء، ح: 2363-صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب فضل ساقي البهائم المحترمة وإطعامها، ح: 2244)

”ایک آدمی راستے میں چلا جا رہا تھا کہ اسے پیاس لگ گئی، وہ (پانی پینے کے لیے) کنویں کے پاس آیا اور اتر کر پانی پیا، پھر نکلنے لگا تو اس نے دیکھا کہ ایک کُتا پیاس کے مارے مٹّی چاٹ رہا ہے، وہ دوبارہ کنویں کے پاس آیا اور اپنے موزے کو پانی سے بھر کر کتّے کے منہ سے لگا دیا، کتّے نے پانی پی لیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی قدر کی اور اسے بخش دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہمارے لیے چوپایوں میں بھی اجر ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر تازہ جگر (جان کی خدمت) میں اجر ملتا ہے۔“

ہر جاندار پر رحم کرنے میں اللہ تعالیٰ نے اجر رکھا ہے، حتیٰ کہ ہماری نظر میں جو حقیر ترین جانور کُتا ہے اس کو پانی پلانے سے ایک شخص کی مغفرت ہو گئی، تو گویا نیکی کے کسی معاملے کو بھی حقیر نہیں جاننا چاہیے خواہ وہ کسی جانور کی خدمت ہی کیوں نہ ہو۔

قُرہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا:

يَا رَسُولَ اللهِ إِنِّي أَذْبَحُ الشَّاةَ وَأَنَا أَرْحَمُهَا، قَالَ: «وَالشَّاةُ إِنْ رَحِمْتَهَا رَحِمَكَ اللهُ.»

(مسند أحمد: 436/3- الأدب المفرد للبخاری: 373- سلسلة الأحاديث الصحيحة: 26)

”اے اللہ کے رسول! میں جب بکری ذبح کرنے لگتا ہوں تو اس پر رحم کرتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تو بکری پر بھی رحم کرے گا تو اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے گا۔“

بکری کو ذبح کرتے ہوئے رحم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اسے اچھی طرح پکڑا یا باندھا جائے تاکہ وہ قابو میں رہے اور درمیانِ ذبح چھوٹ کر تڑپنے نہ لگے، اور ذبح کرنے کا آلہ تیز دھار ہونا چاہیے تاکہ وہ ایک ہی دفعہ اسے ذبح کر ڈالے، ایسا نہ ہو کہ وہ کُند ہو اور تیز نہ چلنے کی وجہ سے بکری کو تڑپانے کا باعث بنے، اسی طرح ذبح کرنے سے پہلے آلۂ ذبح جانور کے سامنے تیز کرنے سے بھی احتراز کرنا چاہیے تاکہ وہ جانور ذبح ہونے سے پہلے ہی موت کے خوف میں مبتلا نہ ہو جائے۔

☆☆☆

طلاق کے نتیجہ میں عورت کا خاوند کے نصف مال کا حقدار ہونا

سوال: اگر طلاق ہو جائے تو کیا عورت کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی جائیداد اور اس کے نقد اموال کا آدھا حصہ طلب کرے؟

جواب: بیوی کے حقوق چاہے وہ طلاق سے پہلے کے ہوں یا بعد کے، شریعت اسلام میں متعین کر دیے گئے ہیں۔ جب طلاق اور جدائی ہو جائے تو طلاق دینے والے شوہر پر مندرجہ ذیل واجبات عائد ہو جاتے ہیں:

1۔ اگر رجعی طلاق کے نتیجہ میں علیحدگی ہوئی ہے تو تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ بیوی کو عدت کے دوران رہائش اور نان ونفقہ دیا جائے اور وہ اس لیے کہ رجعی طلاق کی بنا پر عورت کو بیوی کے بعض حقوق حاصل رہتے ہیں۔

اور اگر طلاق بائن ہو (یعنی رجوع کا حق حاصل نہ ہو) تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے:

ایک رائے یہ ہے کہ حاملہ اور رجعی طلاق والی عورت کی طرح اسے بھی رہائش اور نان ونفقہ کا حق حاصل ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اسے کوئی حق حاصل نہیں، اور ایک درمیانی رائے یہ ہے کہ اسے صرف رہائش کا حق حاصل ہے، تفصیل کے لیے فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

2۔ مُتعہ کا حق اور اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر علیحدگی کے وقت اسے تحفے تحائف کے طور پر کچھ دے دلا دے تاکہ علیحدگی کی بنا پر اسے جس دکھ سے دوچار ہونا پڑا ہے، اس کا مداوا ہو سکے، یہ متعہ کتنا ہو؟ یہ شوہر کی مالی حالت پر انحصار کرتا ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ کیا متعہ کا ادا کرنا واجب ہے یا مستحب ہے؟ بہر حال ان دونوں باتوں کا فیصلہ شرعی عدالتوں یا اداروں پر چھوڑ دیا جائے۔

3۔ اگر مہر میں سے کچھ رقم ابھی تک ادا نہیں ہوئی تو اسے ادا کرے۔

4۔ اگر چھوٹے بچے عورت کی کفالت میں ہیں تو ان کی رہائش اور ان کے اخراجات بھی مرد کے ذمہ رہیں گے اور اس کا تعین بھی شرعی اداروں کے توسط سے ہو گا۔

اس کے علاوہ شوہر کے باقی مال وجائیداد میں سے عورت کے لیے کچھ لینا جائز نہیں ہے، الّا یہ کہ وہ شوہر کی رضامندی سے ہو، لیکن اس کی خواہش اور رضامندی کے بغیر عورت کے لیے کچھ بھی لینا ناجائز ہے، حرام ہے۔ اور دلیل کے طور پر ملاحظہ ہو:

1۔ دین کے مسلّمات میں سے ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا مال بغیر رضامندی کے ہڑپ نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾ (سورۃ النساء:29)

”اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل طریقے سے نہ کھاؤ، الّا یہ کہ وہ باہمی تجارت کے نتیجے میں۔“

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ»

”ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور عزت وآبرو حرام ہے۔“

اور یہ بھی ارشاد فرمایا:

«لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ»

”کسی مسلمان کا مال اس کی دلی خواہش کے بغیر حلال نہیں ہے۔“

گو یہ عام احکامات ہیں لیکن اس میں میاں بیوی بھی داخل ہیں کہ وہ ایک دوسرے کا مال بغیر رضامندی کے نہیں لے سکتے۔

2۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا تُنْفِقُ امْرَأَةٌ شَيْئاً مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا إِلَّا بِإِذْنِ زَوْجِهَا» قِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ، وَلَا الطَّعَامَ؟ قَالَ: «ذَاكَ أَفْضَلُ أَمْوَالِنَا»

”کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر سے کچھ خرچ نہ کرے مگر اپنے شوہر کی اجازت سے، پوچھا گیا کہ اللہ کے رسول! کھانے کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”وہ تو ہمارے بہترین مال میں سے ایک مال ہے۔“

اس حدیث میں گھر کی اضافت شوہر کی طرف کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ کوئی عورت اس میں سے کوئی چیز شوہر کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کرے اور اس بات کی دلیل ہے کہ عورت شوہر کے مال ومتاع میں حصہ دار نہیں ہے۔

3۔ سوال میں جس شراکت کے حصول کا پوچھا گیا ہے (یعنی طلاق کے بعد نصف مال کا حقدار ہونا) اس میں شراکت سے متعلق شرائط اور ارکان شراکت پورے نہیں اترتے، اسلام میں مالی شراکت کے کچھ شروط اور ارکان ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم باہمی رضامندی کا ہونا ہے اور اگر یہ شرائط اور ارکان نہ پائیں جائیں تو پھر یہ شراکت صحیح نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی اثر پایا جائے گا اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ شوہر کی رضامندی کے بغیر اگر عدالت ایسا فیصلہ دے بھی دے تو عورت کے لیے ایسا مال لینا حلال نہ ہو گا۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ”میں تو صرف ایک بشر ہوں، تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر

آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ حجت بازی کر سکتا ہو، تو میں پھر اسے سن کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں تو اگر میں نے اسے اس کے بھائی کا حق دلا دیا ہو تو میں اسے آگ کا ایک قطعہ بخش رہا ہوں۔"

البتہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا ایک بیوی نے اپنے شوہر کے ساتھ کسی قسم کی شراکت کی ہے؟ چاہے وہ اپنے مال سے ہو یا اس کی تجارتی، جدوجہد میں کسی طریقے سے معاونت کی ہو اور اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اس کے کارخانے، دکان یا فارم میں ہاتھ بٹاتی رہی ہو یا کسی جائیداد کی خرید میں اس کی شریک ہو۔ ایسی صورت میں وہ شوہر کے مال میں برابر کی شریک نہیں شمار ہو گی بلکہ اپنے حصے کے تعین کے لیے شرعی پنچایت (تحکیم) کا راستہ اختیار کرے گی۔ اس ضمن میں جدہ کی مجمع الفقہ الاسلامی کی قرار داد نمبر 144 ملاحظہ ہو:

"اگر ایک بیوی نے واقعتاً کسی رہائشی مکان یا جائیداد یا تجارت میں اپنے مال سے یا اپنی جدوجہد سے حصہ لیا ہو تو اس کا بقدر اس کے حصے کے اس چیز میں حق حاصل ہو گا۔"

اور اگر طلاق دینے والا مرد شرعی تحکیم کے فیصلے کو قبول کرنے پر رضامند نہ ہو تو عورت کے لیے جائز ہو گا کہ وہ اس ملک کی عدالتوں کی طرف رجوع کرے تاکہ اپنا حق حاصل کر کے اور وہ قطعاً گناہ گار نہ ہو گی کیونکہ عدالت کی طرف رجوع نہ کرنے کا مطلب ہے، اپنے حق کو ضائع کر دینا اور شریعت کا قاعدہ ہے کہ نہ کسی کو ضرر پہنچاؤ اور نہ کوئی تمہیں ضرر پہنچائے۔

اب اگر عدالت نے اسے شوہر کا آدھا مال دینے کا حکم دیا ہے تو وہ اس میں سے اتنا ہی لینے کی مجاز ہے جو اس کا شرعاً حق بنتا ہے، باقی مال اسے شوہر کو لوٹا دینا چاہیے۔ اور اگر اس نے اپنے حق سے زائد لیا ہے تو وہ اس کے لیے مال حرام ہے جو اسے کبھی نہ بھائے گا۔

ہاں وہ عدالتی اخراجات بھی اس رقم سے لے سکتی ہے کیونکہ شوہر کے شرعی تحکیم کے فیصلے کو نہ قبول کرنے کی وجہ سے وہ عدالت جانے پر مجبور ہوئی۔

اور آخر میں ہم دونوں میاں بیوی کو یہ نصیحت کریں گے کہ وہ شروع ہی سے اپنے اپنے حقوق، معاہدات اور ہبہ کی رقوم کو کسی وکیل یا قانونی ادارے میں رجسٹرڈ کرواتے رہیں تاکہ بعد میں کسی قسم کے التباس یا نزاع کا موقع نہ آنے پائے اور یوں ہر دو افراد کا حق محفوظ رہے۔ واللہ اعلم (فتویٰ کونسل یورپ)

کیا حادثات کے نتیجے میں ملنے والی رقم ترکہ میں شمار ہو گی؟

سوال: ایک مسلمان بھائی اٹلی میں کام کے دوران جل کر وفات پا گیا۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں اس کمپنی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے حکم دیا کہ وہ اس کا معاوضہ ادا کرے، چنانچہ بیمہ کمپنی نے متوفی کے اہل وعیال کو لاحق ہونے والے مادی ضرر کے ازالہ کے لیے مناسب رقم ادا کر دی لیکن اس کے ورثاء نے یہ مقدمہ دائر کر دیا کہ انہیں بھی اس رقم میں سے حصہ ملنا چاہیے کیونکہ انہیں نفسیاتی ضرر کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

عدالت کے فیصلے کے مطابق صرف متوفی کی بیوہ اور نابالغ بچی کو عوض کی رقوم ادا کی گئیں۔ متوفی کے والد اور بھائیوں کا حق تسلیم نہیں کیا گیا۔

بیوہ کو ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار اور بیٹی کو دو لاکھ یورو ادا کیے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس رقم میں باقی ورثا کا بھی حق ہے اور کیا یہ ساری رقم وراثت کے اصولوں کے مطابق تمام ورثا میں تقسیم کی جائے گی یا صرف عدالت کے فیصلے کے مطابق مذکورہ دو افراد تک محدود رہے گی؟

جواب: میراث کے بارے میں جتنی بھی آیات اور احادیث وارد ہوئی ہیں اور میراث کے احکام کے مقاصد اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ میراث کا معیار مالِ عوض کے معیار سے مختلف ہے۔ میراث کا معیار ان اموال سے ہے جو میت اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے، چاہے اس کا تعلق ترکہ سے ہو یا دیت سے ہو یا ان عوض کی رقوم سے ہو، جو اس کی اپنی ذات سے متعلق ہوں۔ یہ ساری کی ساری اس کی اپنی وراثت شمار ہو گی اور عوض میں دی جانے والی رقوم کا معیار ورد اور اَلَم سے ہو جو کسی شخص کو لاحق ہوا ہے اور اس لیے دو اشخاص کو پہنچنے والا مادی یا معنوی ضرر ایک جیسا نہیں ہوتا اور اسی بنا پر عدالت نے بیوہ اور بیٹی میں اس لحاظ سے فرق روا رکھا ہے کہ بیٹی کو بیوہ سے زیادہ رقم بطور عوض ادا کی گئی ہے، اور ان دونوں رقوم کا تعین متوفیٰ کی موت کے بعد کیا گیا ہے۔ یعنی یہ متوفیٰ کے اموال میں سے نہیں دیا گیا۔ اس لیے اسے ترکہ میں شمار نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی باقی ورثا اس میں کسی حصے کے حقدار ہوں گے اور یہ بات اس لیے بھی قابل قبول ہے کہ دعویٰ تو تمام ورثا کی طرف سے کیا گیا تھا لیکن عدالت نے دونوں چیزوں میں فرق رکھتے ہوئے صرف بیوی اور بیٹی کے لیے مال عوض کا فیصلہ دیا۔ یعنی عدالت کی نظر میں میت کے گذر جانے سے بیوی اور بیٹی کو جو نفسیاتی اور معنوی ضرر پہنچا وہ دوسرے ورثہ کو نہیں پہنچا۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ مال عوض ایک ہنگامی معاملہ ہے جو ایک شخص کی موت کے بعد پیش آیا ہے نہ کہ موت سے قبل، اور اس کا تعلق دیت سے بھی نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کیا اس مال عوض کے دیے جانے کا سبب اس شخص کی موت نہیں ہے؟ تو اس کے جواب میں بھی ہم کہیں گے کہ عدالت کے حکم کا سبب وہ نفسیاتی اور معنوی ضرر ہے جو ورثہ میں سے بعض اشخاص کو پہنچا تھا۔ اس لیے ان کا تعین کر دیا گیا۔ اس لیے اس حکم کو دوسرے ورثہ تک متعدی نہیں کیا جا سکتا اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عدالت کا فیصلہ میت کے حق میں نہیں تھا کہ یہ مال اس کا ترکہ شمار کیا جاتا، بلکہ میت کے بجائے کچھ دوسرے لوگوں

سے متعلق تھا جن کی اپنی اپنی ذمہ داریاں تھیں کہ جن کی وجہ سے وہ مالِ عوض کے مستحق قرار پائے۔

(فتویٰ کونسل یورپ)

قسطوں پر اضافی قیمت کے ساتھ خرید کا حکم

سوال: بڑے بڑے تجارتی اسٹورز اپنے گاہکوں کو قسطوں پر اشیاء بیچتے ہیں، چار قسطوں میں ادائیگی مطلوب ہوتی ہے۔ اگر گاہک راضی ہو تو اسے ایک فارم دیا جاتا ہے۔ وہ اس کے مندرجات پُر کرتا ہے اور اس کے ساتھ چند دستاویزات (شناختی کارڈ، ماہانہ تنخواہ گوشوارہ اور اپنے بنک کی تفصیلات) منسلک کرتا ہے۔ تاجر اِن کاغذات یا فائل کو بنک کے سپرد کر دیتا ہے۔ بنک مطلوبہ خرید کردہ چیز کی قیمت کی ادائیگی دو فیصد کٹوتی کے ساتھ کر دیتا ہے اور پھر بنک خریدار سے چاروں اقساط بغیر کسی اضافہ کے پوری کی پوری وصول کرلیتا ہے۔ اس قسم کی بیع وشراء کا معاہدہ مسلم اور غیر مسلم دونوں طرح کے لوگوں میں معمول کی حیثیت رکھتا ہے، اور اسے "ضَعْ وَتَعَجَّلْ" جیسا معاملہ شمار کیا جاتا ہے۔ یعنی تاجر فوری قیمت وصول کرنے کے لیے دو فیصد رقم کم وصول کر کے اپنے پیسے کھرے کر لیتا ہے اور بنک خریدار سے پوری قیمت وصول کرلیتا ہے تو شرعاً اس معاملے کا کیا حکم ہے؟

جواب: پہلے "ضَعْ وَتَعَجَّلْ" (یعنی کچھ کمی کر دو اور جلد اپنی رقوم وصول کرلو) کا مطلب سمجھ لینا چاہیے۔ اس کی بنیاد بنی نضیر کے قصے پر ہے، جس وقت نبی ﷺ نے یہود بنی نضیر کو مدینہ سے جلاوطن کرنے کا حکم دیا تھا تو انہوں نے کہا: ہمیں تو ابھی لوگوں سے اپنا قرضہ وصول کرنا ہے تو نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: «ضَعُوْا وَتَعَجَّلُوْا» "یعنی لوگوں سے کہو کہ ہم تمہارا قرضہ کچھ کم کر دیتے ہیں لیکن تم فوری طور پر اسے ادا کر دو۔"

یعنی یہ مسئلہ قرضدار اور قرض خواہ کے درمیان کا ایک معاملہ ہے۔ لیکن مذکورہ صورت میں تاجر اور بنک کے درمیان نہ قرض کا کوئی معاملہ ہے اور نہ بیع کا، اس لیے اسے "ضَعْ وَتَعَجَّلْ" کے زمرے میں شمار کرنا غلط ہے۔

"ضَعْ وَتَعَجَّلْ" کا جواز قرض خواہ اور قرضدار کے درمیان ہوتا ہے کہ پہلی پارٹی (جس نے قرض دیا ہے) وہ دوسری پارٹی (جس نے قرض لیا ہے) اس کی آسانی کے لیے اپنے قرض میں سے کچھ رقم چھوڑ دیتی ہے۔ یعنی یہاں صرف دو اطراف کے درمیان کا معاملہ ہے، سہ اطراف نہیں۔

مذکورہ صورت میں قرض کی دستاویزات یا مؤخر ادائیگیوں کے چیک کو کچھ کٹوتی کے ساتھ فروخت کرنے کے مترادف ہے۔ اسے ربا عکسی (سود کی ایک الٹی صورت) کہا جا سکتا ہے یا ایک قرض کو مؤخر قرض کے بدلے میں فروخت کرنے کا معاہدہ کہا جا سکتا ہے، اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو کہ اس صورت میں بنک تاجر کو مثال کے طور پر 98 ہزار یورو ادا کرتا ہے، اس ایک لاکھ یورو کے مقابلے میں جو وہ خریدار سے وصول کرے گا یہ تو عین ربا ہے جو کہ حرام ہے۔

ہاں جواز کی مندرجہ ذیل صورت ہو سکتی ہے کہ تاجر خریدار کو ایک چیز ایک مقررہ قیمت پر فروخت کرتا ہے۔ یہ قیمت فوری ادائیگی والی بھی ہو سکتی ہے یا مؤخر ادائیگی والی بھی، لیکن اگر وہ اقساط میں دے رہا ہے اور اس بنا پر اس نے قیمت میں اضافہ کیا ہے تو وہ پہلے سے طے شدہ ہونا چاہیے اور اگر اسے مرابحہ کی اساس پر فروخت کر رہا ہے تو اپنے نفع کی نسبت کا ذکر کرنا چاہیے اور پھر بنک اس چیز کو خود خریدے اور خریدار کے ساتھ ایک مقررہ قیمت پر قسطوں میں فروخت کرنے کا معاہدہ کرے۔ واللہ اعلم

ہمیں نہ پھنسا دے قیامت میں سیلفی

عبادت میں سیلفی تلاوت میں سیلفی ۔۔۔ امامت میں سیلفی خطابت میں سیلفی
عجب مرض ہے عادت خود نمائی ۔۔۔ عیادت میں سیلفی سخاوت میں سیلفی
بنا سیلفیوں کے گزارہ نہیں ہے ۔۔۔ بشاشت میں سیلفی ندامت میں سیلفی
میرے دیس میں سیاسی لوگوں کی عادت ۔۔۔ حمایت میں سیلفی مذمت میں سیلفی
ریا کیا ہے ہم سے نہ پوچھے کوئی بھی ۔۔۔ بتائیں گے ہم دیں کی خدمت میں سیلفی
میں علمائے دیں کو کہوں کیسے بد بد ۔۔۔ ہمیں نہ پھنسا دے قیامت میں سیلفی

(محمد عبداللہ آبادی)

عصر کے بعد سورج زرد ہونے سے پہلے 2رکعت نماز پڑھنا مسنون عمل ہے۔ اسکا ثبوت رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا صحابیات رضی اللہ عنہن، اور تابعین عظام رحمہم اللہ سے ملتا ہے:

1۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"آپ ﷺ نے دو رکعتیں فجر کی نماز سے پہلے اور 2رکعتیں عصر کے بعد نہ سراً اور نہ ہی جہراً چھوڑی ہیں۔"(صحیح بخاری:592)

2۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"جب بھی نبی ﷺ میرے پاس عصر کے بعد تشریف لاتے تو 2 رکعت نماز ادا فرماتے۔"(صحیح بخاری:593)

3۔عبدالعزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ

میں نے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو عصر کے بعد 2 رکعتیں پڑھتے دیکھا اور وہ خبر دیتے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو بیان کیا کہ نبی ﷺ جب بھی ان کے گھر تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے یہ 2 رکعتیں پڑھیں۔(صحیح بخاری:1631)

4۔ عصر کے بعد 2 رکعتیں پڑھنے والے یا پڑھنے کو جائز سمجھنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز کتاب المحلی میں نقل کیے ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ان صحابہ کے صرف نام ذکر کرتا ہوں۔ صاحب ذوق لازمی اس مقام کا مطالعہ فرمائیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ فائدہ ہو گا: سیدنا ابو بکر، سیدنا عمر، سیدنا عثمان، سیدنا علی، سیدنا زبیر، سیدنا عبداللہ بن زبیر تمیم الداری، سیدنا المنکدر، سیدنا زید بن خالد الجہنی، سیدنا ابن عباس، سیدنا ابن عمر، سیدنا ابو ایوب انصاری، سیدنا ابو جحیفہ، سیدنا ابو درداء، سیدنا انس، سیدنا حسن بن علی، سیدنا بلال، سیدنا طارق بن شہاب، سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہم۔ یہ کل 20 صحابہ کرام کے اسمائے گرامی ہیں۔

صحابیات کے اسمائے گرامی: سیدہ ام سلمہ، سیدہ عائشہ۔سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہن۔

تابعین عظام کے اسمائے گرامی: ہشام بن عروہ، انس بن سیرین، طاؤوس، مسروق، اسود، ابو وائل، قاضی شریح، سعید بن مسیب، قاسم بن محمد، عبداللہ بن ابی الہذیل، ابو بردہ بن ابی موسیٰ، عبدالرحمن بن اسود، احنف بن قیس، ابوخیثمہ، ابوایوب الہاشمی، عبدالرحمن بن بیلمانی، ابراہیم بن میسرہ، ابوالشعثاء، اشعث، عمرو بن میمون رحمہم اللہ۔(المحلی بالآثار، لابی محمد علی بن احمد بن حزم الاندلسی، مسئلہ نمبر:285)

عصر کے بعد والی دو رکعات پر اعتراضات اور ان کے جوابات

1۔ عصر کے بعد نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

جواب: یہ اعتراض کرنے سے پہلے آپ ﷺ کے منع کرنے والے فرمان کو مکمل طور پر پڑھ لینا چاہیے کہ آپ نے مطلق طور پر عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے یا مقید طور پر۔۔۔؟

چنانچہ درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیں تو پتہ چلے گا کہ آپ نے مطلقاً عصر کے بعد منع نہیں فرمایا، بلکہ سورج زرد ہونے سے غروب آفتاب تک منع فرمایا ہے۔یعنی عصر کے بعد جب تک سورج بلند ہو، سفید چمکدار ہو آپ نماز پڑھ سکتے ہیں۔

1۔ آپ ﷺ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا، سوائے اس وقت کے کہ جب تک ابھی سورج بلند ہو۔"(سنن ابو داؤد:1274؛ سنن نسائی:572)

2۔ شیخ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ والی حدیث جس میں مطلقاً عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے خاص کریں گے جو سنن ابو داؤد وغیرہ میں صحیح سند سے مروی ہے۔ آپ ﷺ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا سوائے اس وقت کے کہ جب ابھی سورج بلند ہو یعنی اس وقت پڑھ سکتے ہیں۔ لہٰذا جو ابو سعید والی حدیث میں عصر کے بعد منع فرمایا، وہ اس وقت منع ہے کہ جب سورج زرد ہو چکا ہو۔ لیکن جب سورج سفید چمکدار اور بلند ہو تو اس وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔(ارواء الغلیل:2:236)

3۔ امام ابو بکر بن محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے اپنی کتاب: "صحیح ابن خزیمہ" میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اس مذکورہ روایت کو ان مجمل احادیث کی تفسیر قرار دیا ہے، جن میں مطلقاً عصر کے بعد نماز کی ممانعت کا ذکر ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

عصر کے بعد نماز کی ممانعت اس وقت ہے جب سورج بلند نہ ہو بلکہ غروب ہونے کے لیے جھک جائے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ حدیثِ علی (رضی اللہ عنہ) ذکر کرتے ہیں: آپ ﷺ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا، سوائے اس وقت کے کہ جب سورج سفید، بلند ہو، اس وقت پڑھ سکتے ہیں۔(صحیح ابن خزیمہ:1284)

4۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "صرف غروب شمس کے وقت نماز سے منع کیا گیا ہے۔"(مصنف ابن

ابی شیبہ:7337،الصحیحۃ للالبانی، تحت الحدیث:200)

5۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے وقت نماز نہ پڑھو کیونکہ یہ شیطان کے سینگ پر طلوع و غروب ہوتا ہے۔ اور اس کے درمیان والے وقت میں جتنی چاہو نماز پڑھ لو۔" (مسند ابی یعلی:4216،الصحیحۃ:314)

یہ روایت ذکر کرنے کے بعد شیخ البانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "فقہ کی کتابوں میں جو بات مشہور ہے کہ مطلقاً عصر کے بعد نماز منع ہے۔ اگرچہ سورج بلند چمکدار ہی کیوں نہ ہو؟ گزشتہ دونوں احادیث کے مخالف ہے۔ جن احادیث میں مطلقاً عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، ان کو ان دونوں احادیث سے مقید کریں گے۔"

نوٹ: صاحب ذوق حضرات سے گزارش ہے کہ "فتح الباری" سے حدیث نمبر:585 تا593 اور "عون المعبود" سے حدیث نمبر: 1283 تا1280 کی شرح ایک بار پڑھ لیں فائدہ ہو گا۔

ملاحظہ: عصر کے بعد دو رکعت پڑھنے کی ممانعت کے بارے میں عموماً 2 احادیث پیش کی جاتی ہیں، قارئین سے التماس ہے کہ پہلے ان کی اسنادی حیثیت دیکھیں کہ وہ نبی کریم ﷺ سے ثابت بھی ہیں یا آپ ﷺ کی طرف ایسے ہی منسوب کر دی گئی ہیں؟ ان دونوں احادیث کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنے والے حضرات سے التماس ہے کہ "المحلی" کے مسئلہ نمبر:285 کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔

حدیث نمبر1: سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:
آپ ﷺ نماز عصر کے بعد نماز پڑھتے تھے اور دوسروں کو پڑھنے سے منع فرماتے تھے۔" (سنن ابی داؤد:1280)

سندی حیثیت: اس کی سند میں "محمد بن اسحاق" راوی مدلس ہے، اور "عن" سے بیان کرتا ہے، اور تحدیث بھی ثابت نہیں ہے، اس لیے یہ روایت ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (الضعیفۃ:945،الارواء:441)

حدیث نمبر2: "سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

"رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھنے کے بعد میرے گھر آکر 2 رکعتیں ادا کیں۔ میں نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! جب ہم سے یہ 2 رکعتیں رہ جائیں ہم بھی قضا دے لیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں"

سندی حیثیت: اس کی سند منقطع ہے، کیونکہ ذکوان نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ آخری ٹکڑا نہیں سنا، اور پھر یہ روایت منکر بھی ہے، کیونکہ "مسلم" کی حدیث:835 کے مخالف ہے، اس لیے اس پوری حدیث میں سے آخری ٹکڑا ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (الضعیفۃ، الحدیث:946، الارواء، تحت الرقم:440)

اعتراض نمبر2: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور عصر کے بعد 2 رکعت پڑھنے والوں کو مارا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری: 1233)

جواب: یہ اعتراض کرنے سے پہلے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کیا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مطلقاً عصر کے بعد نماز پڑھنا منع سمجھتے تھے؟ اس لیے پڑھنے والوں کو مارتے تھے یا سدّ ذریعہ کے طور پر مارتے تھے کہ کہیں بعد والے لوگ سورج زرد ہونے کے بعد بھی غروب آفتاب تک نہ پڑھتے رہیں؟ چنانچہ جب ہم تفصیلی احادیث کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مطلقاً عصر کے بعد نماز کو منع نہیں سمجھتے تھے، بلکہ وہ تو عصر کے بعد جب تک سورج بلند اور صاف چمکدار ہو، نماز پڑھنا جائز سمجھتے تھے۔ اور وہ مارتے اس لیے تھے کہ بعد میں آنے والے لوگ سورج زرد ہونے سے لے کر غروب تک کے منع والے وقت میں ہی پڑھنا شروع نہ کر دیں۔ (تفصیل درج ذیل ہے):

1۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:
"تم میں سے کوئی بھی شخص یہ کوشش نہ کرے کہ وہ طلوع شمس یا غروب شمس کے وقت نماز پڑھے۔" (صحیح بخاری:585)

2۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں زید بن خالد رضی اللہ عنہ کو عصر کے بعد 2 رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو درہ مارا لیکن زید رضی اللہ عنہ نے نماز جاری رکھی، پھر جب سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے سلام پھیرا تو فرمایا: "اب مارو، اے امیر المؤمنین! اللہ کی قسم! میں ان 2 رکعتوں کو کبھی بھی نہیں چھوڑوں گا جبکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ بھی یہ 2 رکعتیں پڑھا کرتے تھے، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا:
"اے زید بن خالد! اگر مجھے اس بات کا ڈر نہ ہوتا کہ کہیں لوگ اس کو رات تک نماز پڑھنے کا ذریعہ نہ بنا لیں؟ تو میں ان 2 رکعتوں کی وجہ سے نہ مارتا۔" (مصنف عبدالرزاق:3972)

معلوم ہوا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سدّ ذریعہ کے طور پر منع کرتے تھے، حقیقت میں جواز کے قائل تھے۔

3۔ "آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی تو ایک آدمی کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "بیٹھ جا! اہل کتاب اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ ان کی نماز کے درمیان میں فاصلہ نہیں ہوتا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: "ابن الخطاب نے اچھا کیا۔" (مسند احمد:23170)

اس سے ثابت ہوا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ عصر کے بعد نماز کو منع نہیں سمجھتے تھے، اس لیے نماز پر اعتراض نہیں کیا بلکہ فرض کے بعد والی نماز کے درمیان فرق اور فاصلہ نہ کرنے پر اعتراض کیا تھا ورنہ اگر عصر کے بعد نماز کو مطلقاً منع سمجھتے ہوتے تو یہ بھی اعتراض کر دیتے اور پاس نبی ﷺ بھی موجود تھے۔

4۔ "طاؤس تابعی کہتے ہیں: صحابی رسول سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے پہلے عصر کے بعد 2 رکعت پڑھا کرتے تھے، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں چھوڑ دیں، پھر جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے تو سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے پھر پڑھنی شروع کر دیں تو سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ان 2 رکعتوں کی

وجہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مارا کرتے تھے اس لیے میں نے چھوڑ دیں تھیں، طاؤس کا بیٹا کہتا ہے:
"میرے ابو جان بھی یہ 2 رکعتیں نہیں چھوڑتے تھے۔" (مصنف عبدالرزاق: 3977)
ثابت ہوا شرعاً یہ 2 رکعتیں ممنوع نہیں تھیں، بلکہ سدّ ذریعہ کے طور پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ منع کرتے تھے۔

اعتراض نمبر 3: ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ عصر کے بعد 2 رکعتیں پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ تھا، یعنی امت کے لیے جائز نہیں بلکہ منع ہے۔

جواب: قارئین سے گزارش ہے کہ اعتراض نمبر 1 کے تحت 20 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تین صحابیات اور 20 تابعین عظام کے نام نقل کر دیے گئے ہیں، ان پر دوبارہ ایک نظر فرما لیں اور ان کے اصل ماخذ بھی دیکھ لیں۔ جب اتنے صحابہ کرام، صحابیات اور تابعین عظام عصر کے بعد 2 رکعات پڑھتے تھے یا پڑھنے کو جائز سمجھتے تھے، تو پھر یہ 2 رکعات خاصہ کیسے بن گئیں؟ اور خاصہ کی وہ کون سی تعریف ہے جو ان 2 رکعتوں پر لاگو ہوتی ہے؟

معلوم ہوا کہ 2 رکعتیں خاصہ نہیں بلکہ عامہ ہیں، امت کے لیے بھی مسنون عمل ہے، ان کو غیر مسنون کہنا درست نہیں ہے، اور خاصہ کی کوئی دلیل نہیں ہے، صرف اتنی بات ہے کہ ہم لوگ پڑھتے نہیں ہیں یا اکثر لوگوں کو ان کا علم ہی نہیں ہے۔

نوٹ: خاصہ کے جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان کی سندی حیثیت اعتراض نمبر 1 کے جواب میں واضح کر دی گئی ہے۔ قانون یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کام بھی کریں وہ عام ہی ہوتا ہے، اور ہمارے لیے بھی وہ مسنون عمل ہوتا ہے، البتہ اگر اس کام کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہونے کی کوئی دلیل آ جائے تو وہ آپ کے لیے خاص بن جائے گا، جب تک دلیل نہ آئے وہ کام عام ہی سمجھا جائے گا۔

اعتراض نمبر 4: ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کے بعد جو 2 رکعتیں پڑھتے تھے وہ آپ کی ظہر کے بعد والی تھیں، جو ایک دن آپ سے رہ گئی تھیں۔

جواب: ذرا غور فرمائیں کیا وہ ظہر کے بعد والی 2 رکعتیں ایک بار رہ گئی تھیں یا ہمیشہ رہ گئی تھیں؟ اگر وہ ایک دن رہ گئی تھیں تو پھر ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پڑھ لی تھیں۔

کسی آدمی کی کوئی نماز رہ جائے تو وہ ایک ہی دفعہ قضا دیتا ہے یا روزانہ اس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے؟ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان آپ نے پڑھ لیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان 2 رکعتوں کو بھی نہیں چھوڑتے تھے، بلکہ فرماتی ہیں:
"جب بھی آپ نماز عصر کے بعد میرے گھر تشریف لاتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔" (صحیح بخاری: 593)
پھر یہ ظہر والی تو نہ ہوئیں؟ ظہر والی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ہی پڑھی ہیں۔

اعتراض نمبر 5: ایک نظریہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک عمل شروع کرتے تو پھر وہ کام کرتے ہی چلے جاتے تھے، اس پر ہیشگی کرتے تھے، ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی 2 رکعتیں عصر کے بعد پڑھیں، پھر ان پر ہیشگی کی، رکعتیں دراصل ظہر ہی کی تھیں۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ جب یہ 2 رکعتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ نہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر ہیشگی کی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
«أَحَبُّ الأَعْمَالِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ» (صحیح بخاری: 6464)
"اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب عمل وہ ہے جس پر ہیشگی کی جائے اگرچہ وہ کم ہی ہو۔"
سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کام کرتے تو اس پر ہیشگی فرماتے تھے۔ (صحیح مسلم: 1934)
تو ثابت ہوا کہ عصر کے بعد 2 رکعت پر آپ نے ہیشگی کی ہے، اور یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ہمیں تو بالاولیٰ ان پر ہیشگی کرنی چاہیے! یا کم از کم اگر عملی سستی ہے تو اس کو غیر مسنون تو نہیں کہنا چاہیے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم اس سے یہ اصول سمجھ لیں کہ جس عمل کی یا جس نماز کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار قضا دی تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیشگی اور دوام فرماتے رہے، تو میرے علم کے مطابق یہ کلی قاعدہ نہیں ہے، کیونکہ اس کے خلاف احادیث میں مثالیں موجود ہیں:

مثال نمبر 1: سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک سفر میں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات کے آخری وقت میں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا، سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے ذمہ داری لی کہ میں صبح کی نماز کے لیے بیدار کروں گا، لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو بھی نیند آ گئی اور سب سوئے رہے، جب سورج کی کرنیں ان پر پڑیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے۔۔۔ پھر سورج طلوع ہونے کے بعد سب نے نماز پڑھی۔ (صحیح بخاری: 595)

نوٹ: یہ فجر کی نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قضا کی لیکن بعد میں کبھی دوبارہ اس کو نہیں پڑھا۔

مثال نمبر 2: ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عصر کی نماز رہ گئی تو آپ نے شام کے بعد پڑھی۔ (صحیح بخاری: 596)

نوٹ: یہ عصر کی نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اس طرح مغرب کے بعد بھی نہیں پڑھی؟

اس سے ثابت ہوا کہ قضاء کی ہوئی نماز کو دوبارہ پڑھنا اور اس پر ہیشگی کرنا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصول نہیں تھا، البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیک کام ابتدا سے، نئے سرے سے شروع کرتے تو اس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش ہوتی تھی کہ اس پر ہیشگی کی جائے جیسے ابھی شروع میں 2 احادیث بخاری و مسلم کی گزری ہیں۔

مذکورہ بالا تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ عصر کے بعد 2 رکعت پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

هذا ما عندي والله أعلم بالصواب

ہمارے دینی ادارے بحمد اللہ سب سے بہتر خدمت سرانجام دے رہے ہیں ۔اللہ تعالیٰ ان کے تمام منتظمین کے اخلاص کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ان کی وجہ سے اللہ کا قرآن اور نبی ﷺ کی احادیث روشنی پھیلا رہی ہیں دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھا ہے ایک تو حفظ حدیث اور حفظ قرآن ہر طالب علم کیلئے لازمی ہونے چاہیں مثلاً نخبۃ الحدیث یا اربعین نوویہ ، ریاض الصالحین کے ایک بڑے حصہ کا حفظ لازم ہو۔اور اس کی تدریس بطور تزکیہ شامل ہونی چاہیئے۔اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے کم از کم 10،20 پارے حفظ کرنا بھی لازمی ہوں۔

دوسری اہم ترین بات کہ قرآن کریم کی تجوید و قراءت کیلئے بھی اپنے مدرسہ کے نصاب میں لازمی ایک پیریڈ رکھا جائے تاکہ مدرسہ سے فارغ ہونے والا طالب جب عالم، خطیب ، اور و مدرس کی حیثیت سے میدان عمل میں قدم رکھے تو اس کے پاس یہ بنیادی ذخیرہ پہلے سے موجود ہو۔ہمارے مدارس میں ان دونوں کا ایک ساتھ اہتمام ہو جائے تو اللہ کے فضل سے بڑے اچھے اور مثبت نتائج نکلیں گے ۔ آج کی نشست میں ہم قرآن کریم کی تجوید و قراءت کی اہمیت پر بات کرنا چاہیں گے تاکہ اسے نصاب کا حصہ بنانے میں کوئی ذہنی تحفظ نہ ہو۔واللہ المستعان

اہل اسلام کی خوش بختی ہے کہ اللہ کریم کا آخری کلام بعینہ محفوظ و مصئون ان کے پاس ہے۔ جبکہ دنیا کے کسی مذہب کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔ قرآن کریم رب کا کلام ہے۔اس لیے اس کا حق ہے کہ اسے سمجھا جائے اس پر عمل کیا جائے اسے پھیلایا جائے ۔اور اس کے حقوق میں سے ایک اہم ترین حق یہ ہے کہ صحت الفاظ اور ضروری قواعد تجوید کی رعایت کرتے ہوئے اس کی تلاوت کی جائے۔ قرآن کریم میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا ﴾(سورۃ الفرقان:33)

”ہم نے اسے ترتیل کے ساتھ نازل کیا ہے۔“

اور سورۃ المزمل میں ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم فرمایا ہے:

﴿ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا ﴾ (سورۃ المزمل:4)

”اور قرآن کی تلاوت اطمینان سے صاف صاف کیا کرو۔“

ترتیل کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

”ارشاد ہوا کہ قرآن شریف کو آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کر، تاکہ خوب سمجھتا جائے، اس حکم کے رسول اللہ ﷺ بھی عامل تھے۔“

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ

”آپ قرآن کریم کو ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے جس سے بڑی دیر میں سورت ختم ہوتی تھی گویا چھوٹی سی سورت بڑی سے بڑی ہو جاتی تھی۔“

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی قراءت کا وصف پوچھا گیا تو بتایا کہ آپ ﷺ خوب مد (لمبا) کر کے پڑھا کرتے تھے پھر آیت (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) پڑھ کر سنائی جس میں لفظ اللہ پر، لفظ رحمٰن پر، لفظ رحیم ، پر مد کیا۔(صحیح بخاری)

ابن جریر طبری میں ہے کہ

”ہر ہر آیت پر آپ ﷺ پورا پورا وقف کرتے تھے، جیسے آیت (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) پڑھ کر وقف کرتے آیت (الحمد للہ رب العلمین) پڑھ کر وقف کرتے آیت (الرحمٰن الرحیم) پڑھ کر وقف کرتے آیت (مالك یوم الدین) پڑھ کر ٹھہرتے۔(مسند احمد، سنن ابو داؤد، جامع ترمذی)

مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ

قرآن کے قاری سے قیامت والے دن کہا جائے گا کہ پڑھتا جا اور چڑھتا جا اور ترتیل سے پڑھ جیسے دنیا میں ترتیل سے پڑھا کرتا تھا۔ تیرا درجہ وہ ہے جہاں تیری آخری آیت ختم ہو گی۔(سنن ابو داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی)

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ

لا تنثروه نثر الرمل ولا تهذوه هذ الشعر ، قفوا عند عجائبه ، وحركوا به القلوب ، ولا يكن هم أحدكم آخر السورة . رواه البغوي .

”ریت کی طرح قرآن کو نہ پھیلاؤ اور شعروں کی طرح قرآن کو بے ادبی سے نہ پڑھو اس کی عجائبات پر غور کرو اور دلوں میں اثر لیتے جاؤ اور اس میں دوڑ نہ لگاؤ کہ جلد سورت ختم ہو۔“

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ

حروف کو تجوید کے ساتھ اور وقفوں کی معرفت (یعنی کہاں ٹھہرنا ضروری ہے اور کہاں ملانا ضروری ہے) کے ساتھ پڑھنا ہے ۔ جب ترتیل کے ساتھ قرآن کریم پڑھا جائے گا۔ تبھی اس کی تلاوت کا حق ادا ہو گا اور ایسی ہی تلاوت پر حسنات اور انعامات خداوندی کا وعدہ ہے۔ لیکن اگر تلاوت تجوید کی رعایت

کے ساتھ نہیں، بلکہ اس کے خلاف ہے تو اس سے تلاوت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

محققین علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ

''بغیر تجوید قرآن پڑھنے والا مستحق ثواب نہیں بلکہ (بعض دفعہ) گناہ گار ہو جاتا ہے۔''

علم تجوید و قراءت کے مشہور امام محمد بن محمد بن یوسف الجزری رحمہ اللہ معروف بہ علامہ جزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَالْأَخْذُ بِالتَّجْوِيْدِ لَازِمٌ مَنْ لَّمْ يُجَوِّدِ الْقُرْآنَ آثِمٌ لِأَنَّهُ بِهِ الْإِلٰهُ اَنْزَلَ وَهٰكَذَا اِمِنْهُ إِلَيْنَا وَصَلَ."

''تجوید کا حاصل کرنا ضروری ولازم ہے۔جو شخص تجوید سے قرآن نہ پڑھے گناہگار ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالی نے تجوید ہی کے ساتھ اس کو نازل فرمایا ہے۔اور اسی طرح نبی ﷺ سے ہم تک پہنچا ہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا قول جسے ابن اثیر، ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر ج9 ص2017 اور امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم (1/324 میں) الشقیری نے السنن والبدعات ص200 میں اور فتاوی امام ابن باز رحمہ اللہ 26/61 اور فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ: 3/213) اور مجلہ المنار کے مقالہ '' الحکمۃ فی انزال القرآن:8/258) میں ذکر کیا ہے، کہ

"رب تال القرآن أو رب قارئ للقرآن والقرآن يلعنه."

'' بہت سے لوگ قرآن کی تلاوت اس حالت میں کرتے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کرتا جاتا ہے۔''

کیونکہ قرآن کی تلاوت خود رسول اللہ ﷺ نے سکھائی ہے۔جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت ہے کہ وہ خود کسی شخص کو قرآن کریم پڑھارہے تھے اس نے إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ، کو مد کے بغیر پڑھا تو آپ نے اس کو ٹوکا اور فرمایا کہ

''حضور ﷺ نے مجھے اس طرح نہیں پڑھایا ہے۔ اس نے دریافت کیا کہ پھر حضور ﷺ نے آپ کو کس طرح پڑھایا ہے؟ تو سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی اور لِلْفُقَرَآءِ پر مد کیا (سلسلہ احادیث صحیحہ، الألبانی حدیث صحیح، فضائل القرآن والأدعیۃ حدیث 2921)

غور کرنے کا مقام ہے کہ حرف یا حرکت کے چھوٹنے یا بدلنے پر نہیں صرف مد کے چھوڑنے پر شاگرد کو ٹوکا جارہا ہے اور حضور ﷺ کی قرأت کے مطابق پڑھ کر سنایا جارہا ہے، تاکہ وہ حرف کو کھینچ کر پڑھنے میں بھی سنت کی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو۔ اس لیے قرآن کریم کو اسی طرح پڑھاجائے جس طرح وہ نازل ہوا ہے۔یعنی حروف کو ان کا حق اسی طرح دیا جائے کہ مخارج وصفات اور دیگر قواعد کے اعتبار سے ان کی ادائیگی درست ہو اور بے موقعہ وقف نہ کیا جائے۔

خلاف تجوید قرآن پڑھنا موجب گناہ ہے علماء کے فتاویٰ

برصغیر میں سیرت النبی کی اولین اور روحانی سیرت کی کتاب ''رحمۃ اللعالمین'' کے مصنف سے کسی نے سوال کیا کہ

''تجوید کا حکم کیا ہے؟ فن تجوید کا مرتبہ دیگر فنون کے مقابلہ میں کیا ہے؟ تجوید کے خلاف قرآن پڑھنا اور پڑھانا کیسا ہے؟ قرآن کس شخص پر لعنت کرتا ہے، وہ حدیث مع ترجمہ وخلاصہ کے ضرور تحریر فرمائیں، مجہول قرآن پڑھنے والے کی امامت (جب کہ نہ تو لحن جلی کی خبر رکھتا ہو اور نہ لحن خفی کا پتہ ہو) اور مقتدی میں عمدہ تجوید کے ساتھ قرآن پڑھنے والا موجود ہو، تو ایسی نماز کا کیا حکم ہو گا؟

اسکے جواب میں قاضی محمد سلیمان منصورپوری رحمہ اللہ (پیدائش 1867ء ضلع پٹیالہ تاریخ وفات 30 مئی 1930ء) نے جواب دیا کہ

''تجوید سے اس قدر واقفیت فرض ہے کہ آدمی قرآن شریف بقدرِ ضرورت صحیح پڑھ سکے، جس سے اس کی نماز میں فساد نہ آئے اور پورا فن تجوید مہارت کے ساتھ سیکھنا فرضِ کفایہ ہے، یعنی اگر چند حضرات بھی اس میں مہارت پیدا کرلیں تو دوسروں کے لئے اس میں محنت کرنا ضروری نہیں ہوتا، لیکن قرآنِ کریم مجہول پڑھنا کسی حالت میں درست نہیں ہے، اس لئے امام کو متعین کرتے وقت ان باتوں کا لحاظ کرنا چاہئے۔ لیکن اگر کسی امام کو متعین کر دیا گیا اور وہ بہ قدر ضرورت قرأت کرنے پر قادر ہے اور مقتدیوں میں اس سے اچھے پڑھنے والے قاری اور اچھے مجود موجود ہوں، تو ایسی صورت میں امامت کا حق ان مقتدی قاریوں کو نہیں ہے، بلکہ متعین امام ہی امامت کا حق دار ہو گا۔ قاضی صاحب نے معروف امام جزری رحمہ اللہ کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ

"وَالْأَخْذُ بِالتَّجْوِيْدِ لَازِمٌ مَنْ لَّمْ يُجَوِّدِ الْقُرْآنَ آثِمٌ لِأَنَّهُ بِهِ الْإِلٰهُ أَنْزَلَ وَهٰكَذَا اِمِنْهُ إِلَيْنَا وَصَلَ ."

''یعنی تجوید کا علم سیکھنا ضروری ہے اور جو بغیر تجوید کے قرآن پڑھتا ہے وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔''

م(قدمۃ جزریۃ:10، حاشیۃ فوائد مکیۃ:3)

اور جان لو کہ متعین امام بہر حال امامت کا زیادہ حق دار ہے۔

واعلم أن صاحب البيت ومثله إمام المسجد الراتب أولى بالإمامة من غيره مطلقاً

(الدر المختار مع الرد المختار:2/297)

فقط واللہ تعالی اعلم (احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ اور اسی فتویٰ کی تائید کی شیخ الحدیث مولانا شبیر

احمد نے کی۔ 31 دسمبر 1912)

یوں تو بڑے بڑے علماء و مفتیان کرام نے قرآن کریم کو بغیر تجوید پڑھنے پر سخت نکیر فرمائی ہے جن میں امام الشیخ عبد العزیز ابن باز رحمۃ اللہ علیہ مفتی دیار سعودیہ، استاذ العلماء الشیخ عثیمین وغیرہ بہت نمایاں ہیں۔ اس نشست میں ہم دمشق کے معروف مفتی الشیخ أحمد شریف النعسان استاذ شریعہ کالج و مدرس و خطیب دار الافتاء کلیۃ الشرعیۃ بجامعہ دمشق سے پوچھا گیا کہ

"کیا امام جزری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ جو شخص قرآن تجوید کے ساتھ نہیں پڑھتا وہ گناہ گار ہے؟

هل صحيح بأن الذي يقرأ القرآن من غير تجويد آثم؟

"تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا:

"فلا خِلافَ بَينَ الفُقَهاءِ فِي أنّ الاشتِغالَ بِعِلمِ التّجويدِ فَرضُ كِفايَةٍ، وأمّا العَمَلُ به فهوَ واجِبٌ على من يَقْدِرُ عَلَيهِ، لأنّ اللهَ تعالى أنزَلَ به كِتابَهُ المَجيدَ، وَوَصَلَ إلَينا عن سَيّدِنا رَسولِ الله صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وَعلى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلّمَ مُتَواتِراً بالتّجويدِ."

"اس باب میں فقہاء کے درمیان اتفاق ہے کہ علم تجوید حاصل کرنا فرض کفایہ ہے اور اس پر عمل کرنا یعنی اس کے مطابق قرآن پڑھنا واجب ہے کیونکہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے تجوید کے ساتھ ہی نازل فرمایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح سکھایا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک اسی طرح تجوید کے ساتھ پہنچا ہے۔"

"وذَهَبَ المُتَأخّرونَ من الفُقَهاءِ إلى وُجوبِ مُراعاةِ قَواعِدِ التّجويدِ فيما يَتَغَيّرُ به المَبنى ويُفسِدُ المَعنى، وإلى هذا أشارَ مُحَمّدٌ الجَزرِيُّ في مَنظومَتِهِ في التّجويدِ:

"والأخْذُ بالتّجويدِ حَتْمٌ لازِمُ و من لم يُجَوّدِ القُرآنَ آثِمُ."

"جبکہ تمام فقہاء متاخرین بھی اس پر متفق ہیں کہ اتنا علم حاصل کرنا جس سے قواعد تجوید کا لحاظ ہو سکے اور قرآن کا معنی نہ بدلے واجب ہے۔ اسی کی طرف امام محمد بن یوسف جزری رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے کہ

"جو شخص قرآن کریم کو تجوید کے ساتھ نہ پڑھے وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔"

اور اسی کی طرف انہوں نے اپنی کتاب النشر في القراءات العشر، بتحقیق علی محمد الضباع، الناشر المطبعة التجاریۃ الکبری) میں اشارہ فرمایا ہے کہ

"ولا شَكَّ أنَّ الأُمّةَ كما هُم مُتَعَبّدونَ بِفَهْمِ مَعاني القُرآنِ العَظيمِ وإقامَةِ حُدودِهِ، كذلكَ هُم مُتَعَبّدونَ بِتَصحيحِ ألفاظِهِ وإقامَةِ حُروفِهِ على الصِّفَةِ المُتَلَقّاةِ من أئِمّةِ القُرّاءِ والمُتّصِلَةِ بالنّبِيّ صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وَعلى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلّمَ

"بلاشبہ جس طرح یہ امت پابند ہے اس بات کی کہ وہ قرآن کریم کے معانی کو سمجھے اس کے احکام کو بجالائے اسی طرح وہ اس بات کی بھی پابند ہے کہ قرآن کریم کو اس کے صحیح الفاظ اور قراء کرام کی جانب سے پڑھائے گئے طریقہ تجوید کے مطابق پڑھے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح پڑھنا سکھایا گیا ہے۔"

اور اسی بنا پر جو شخص علم تجوید کو پورے کا پورا سیکھنے پر قدرت رکھتا ہے، اسے یہ علم ضرور سیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں (حدیث سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مطابق) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فمن كانَ قادِراً على تَعَلمِ أحكامِ التجويدِ لِتَصحيحِ تِلاوَتِهِ وَجَبَ عَلَيهِ أن يَتَعَلّمَ، وإلا فلا، وذلكَ لِقَولِهِ صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وَعلى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلّمَ اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ، وَالّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ أَجْرَانِ

(صحیح مسلم: 1862) واللہ تعالی أعلم (رقم الفتوی، 6019 بتاریخ 27 ستمبر 2011)

"قرآن کریم کا ماہر اور مشاق بزرگ فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔ اور جو قرآن کو اٹک اٹک کر اور مشقت کے ساتھ پڑھتا ہے اس کو دوہرا اجر ملے گا۔"

ہم لوگوں نے قرآن کریم کی تجوید و علم قراءت کی اہمیت کو ملحوظ ہی نہیں رکھا اور اہل علم کے ان فتاویٰ کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیا جس کا نتیجہ ہے کہ اکثر خطباء قرآن غلط پڑھتے ہیں اور خاص طور پر گی۔ گی۔ گی۔ گین نن (معذرتاً) کی طرز اور سُر بڑی مشہور ہو چکی ہے۔ کئی منبروں پر ایسی مجہول تلاوت ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی اہمیت کو سمجھنے والا اس پر تڑپ اٹھتا ہے۔

کیونکہ ہمارے مدارس نے اس کی طرف توجہ دی ہی نہیں۔ اس لیے تمام مدارس کے منتظمین سے تکرار کے ساتھ گزارش کی جاتی ہے کہ

اپنے اپنے مدراس کے نصاب پر نظر ثانی کریں اور حفظ حدیث، تدریس ریاض الصالحین اور حفظ قرآن بمعہ تجوید و علم قراءات کا لازمی اضافہ فرمائیں تاکہ مستقل کے خطباء قرآن کریم پبلک میں قرآن کریم کی صحیح قرات کر سکیں۔ اور حفظ حدیث کی برکت سے دین و دنیا میں سرخرو ہوں۔

إن أريد إلا الإصلاح ، وما توفيقي إلا بالله

☆☆☆

کتاب الطہارت۔ مذی وغیرہ کے متعلق

حدیث نمبر:25

عَنْ أُمِّ قَيْسٍ بِنْتِ مِحْصَنٍ الأَسَدِيَّةِ أَنَّهَا أَتَتْ بِابْنٍ لَهَا صَغِيرٍ , لَمْ يَأْكُلِ الطَّعَامَ إلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَأَجْلَسَهُ فِي حِجْرِهِ , فَبَالَ عَلَى ثَوْبِهِ , فَدَعَا بِمَاءٍ فَنَضَحَهُ عَلَى ثَوْبِهِ , وَلَمْ يَغْسِلْهُ.

وَفِيْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رضي الله عنها أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِيَ بِصَبِيٍّ , فَبَالَ عَلَى ثَوْبِهِ , فَدَعَا بِمَاءٍ , فَأَتْبَعَهُ إيَّاهُ.

وَلِمُسْلِمٍ: فَأَتْبَعَهُ بَوْلَهُ , وَلَمْ يَغْسِلْهُ.

[رواه البخاري، كتاب الوضوء، باب بول الصبيان، برقم 223، وفي لفظ له برقم 5693، ومسلم، كتاب الطهارة، باب حكم بول الطفل الرضيع وكيفية غسله، برقم 287. رواه البخاري، كتاب الوضوء، باب بول الصبيان، برقم 222 بلفظه، ومسلم، كتاب الطهارة، باب حكم بول الطفل الرضيع وكيفية غسله، برقم 286]

حدیث مبارکہ کا سلیس ترجمہ

سیدنا ام قیس بنت محصن اسدیہ رضی اللہ عنہ بیان کرتی ہیں کہ وہ اپنے چھوٹے بچے کو رسول پاک ﷺ کی خدمت میں لائی جو ابھی کھانا نہیں کھاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنی گود میں بٹھایا تو اس نے آپ ﷺ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا، آپ ﷺ نے پانی منگوایا، اسے اپنے کپڑے پر چھڑکایا اسے دھویا نہیں اور ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک بچے کو لایا گیا۔ تو اس نے آپ ﷺ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا آپ ﷺ نے پانی منگوایا اور اس پر بہا دیا۔

صحیح مسلم کی روایت میں ہے: آپ ﷺ نے پانی کو اس کے پیشاب پر بہایا اور اسے دھویا نہیں۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حدیث مبارکہ کے بعض الفاظ کے معانی

1:أَجْلَسَ:اس(آپ) نے بٹھایا۔

2:حِجْرِ: گود

3:بَالَ:اس نے پیشاب کیا۔

4:ثَوْبِ: کپڑا۔

5:دَعَا بِمَاءٍ:اس(آپ) نے پانی منگوایا۔

6:فَنَضَحَهُ:اس پانی کے چھینٹے مارے۔

7:لَمْ يَغْسِلْهُ:اسے دھویا نہیں۔

8:أَتْبَعَهُ:اس کے پیچھے لگایا۔ اس کے بعد کیا یعنی پانی بہایا۔

حدیث سے حاصل ہونے والے بعض مسائل واحکام

1۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اپنے چھوٹے بچوں کو برکت حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس لانا۔

2۔ رسول اکرم ﷺ کا چھوٹے بچوں سے پیار و محبت کرنا۔

3۔ چھوٹے بچوں کے پیشاب وغیرہ کرنے پر ان کو یا ان کے والدین کو برا بھلا نہ کہنا۔

4۔ دودھ پیتا بچہ (لڑکا) جس نے ابھی کھانا شروع نہ کیا ہو اگر کسی کے کپڑوں پر پیشاب کر دے تو اس جگہ پر پانی چھڑکا دیا جائے جہاں اس نے پیشاب کیا ہے اسے دھونا ضروری نہیں، صرف چھڑکاؤ سے نجاست کا حکم ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ بچہ اگر لڑکی ہے اور اس نے کسی کے کپڑوں وغیرہ پر پیشاب کر دیا تو اس کپڑے وغیرہ کو دھونا ضروری ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ ﷺ: «يُغسَلُ مِنْ بوْل الجاريَة، ويُرَشُّ مِنْ بوْل الغُلام» أخرجه أبو داود والنسائي، وصححه الحاكم.

سیدنا ابو السمح رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بچی کے پیشاب کو دھویا جائے اور بچے کے پیشاب پر چھینٹے مارے جائیں۔" اور محدثین نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

5۔ جب بچہ کھانا کھانا شروع کر دے تو پھر اس کے پیشاب کا حکم بڑے آدمی کے پیشاب کی طرح کا ہے۔

6۔ شریعت اسلامیہ سراپا رحمت ہے۔ ظاہر ہے چھوٹے بچے عموماً بار بار پیشاب کر دیتے ہیں اور پیشاب کے وقت بتانے پر قدرت بھی نہیں رکھتے ہیں تو ایسی صورت میں شریعت نے کپڑوں کو دھونے کے بجائے چھینٹوں پر اکتفاء کافی قرار دیا ہے۔

طہارت کی کتاب، مذی وغیرہ کے متعلق

حدیث نمبر:26

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ - رضي الله عنه - قَالَ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ ، فَبَالَ فِي طَائِفَةِ الْمَسْجِدِ، فَزَجَرَهُ النَّاسُ ، فَنَهَاهُمُ النَّبِيُّ ﷺ فَلَمَّا قَضَى بَوْلَهُ أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِذَنُوبٍ مِنْ مَاءٍ , فَأُهْرِيقَ عَلَيْهِ.

(رواه البخاري، كتاب الوضوء، باب ترك النبيﷺ والناس الأعرابي حتى فرغ من بوله في المسجد، برقم 219، وباب صب الماء على البول في المسجد، برقم 221، ورقم 6025، ومسلم، كتاب الطهارة، باب وجوب غسل البول وغيره من النجاسات إذا حصلت في المسجد، وأن الأرض تطهر بالماء من غير حاجة إلى حفرها، برقم 284، و285)

حدیث مبارکہ کا سلیس ترجمہ

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بدوی شخص آیا، تو اس نے مسجد کے ایک کونے میں پیشاب کر دیا۔ لوگوں نے اسے ڈانٹا، نبی کریم ﷺ نے انہیں روک دیا جب اس نے پورا پیشاب کر لیا، تو نبی کریم ﷺ نے پانی کا ایک ڈول لانے کا حکم دیا تو اس پر انڈیل دیا گیا۔(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

مفرداتُ الحدیث:

1۔أَعْرَابِيٌّ:بدوی، خانہ بدوش۔

2۔فِي طَائِفَةِ الْمَسْجِدِ:مسجد کے کونے میں۔

3۔فَزَجَرَهُ النَّاسُ:لوگوں نے اسے ڈانٹا۔

4: ذَنُوبٍ:ڈول۔

5:أُهْرِيقَ عَلَيْهِ:اس پر انڈیل دیا گیا۔

6 :قَضَى بَوْلَهُ: اس نے اپنا پیشاب پورا کیا۔ یعنی قضائے حاجت سے فارغ ہوا۔

حدیث سے حاصل ہونے والے بعض مسائل واحکام

1۔ جاہل، فقہی مسائل میں شرعاً معذور ہے۔ البتہ توحید کے مسئلہ میں جہالت سمیت کوئی بھی عذر شرعا قبول نہیں ہے بلکہ عند اللہ اس کا مواخذہ ہے۔

2۔ لوگوں کے ساتھ نرمی کا حکم ہے خصوصاجب کسی کو مسئلہ معلوم نہ ہو۔ یہی حکم ان بچوں کے لیے بھی ہے جن کو شرعی مسائل ابھی تک معلوم نہیں۔ البتہ بچوں سمیت بڑے لوگ جو شرعی و فقہی مسائل سے ناواقف ہیں، ان کو احسن طریقے سے تعلیم دینا ضروری ہے۔

3۔ غلطی اور گناہ کے کاموں میں مکمل خاموشی درست نہیں ہے بلکہ غلطی اور گناہ کرنے والے کی اصلاح ضروری ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بدوی شخص کی کی۔ اس کو بتایا کہ مساجد بول براز کے لیے نہیں ہیں بلکہ یہ اللہ کے ذکر اور نماز اور قران مجید پڑھنے کے لیے ہیں۔

4۔ نماز والی جگہ پر پیشاب کرنا حرام ہے اور جہاں بھی پیشاب کیا جائے گا وہ جگہ پلید کے حکم میں ہوگی۔

5۔ یہ حدیث انسان کے پیشاب کے پلید ہونے پر دلیل ہے۔

6۔ زمین پر اگر کوئی شخص پیشاب کر دے تو اسے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس پر پانی بہا دیا جائے۔ وہاں سے مٹی کھرچنے کا حکم نہیں ہے۔ اور اگر پیشاب کا نشان موجود نہیں بلکہ دھوپ وغیرہ سے خشک ہوگیا ہے تو اس جگہ کو دھونے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ پاک کے حکم میں ہے۔

7۔ مساجد کا احترام کیا جائے اور انہی پاک رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

8۔ مساجد کو پلید و بدبودار چیزوں سے پاک رکھنا ضروری ہے۔ بلکہ مسجد کو صاف وستھرا رکھنے کا حکم ہے۔

9۔ اسلام کے بتائے ہوئے اخلاق کے مطابق کسی کو دوران حاجت ضروری کے روکنا نہیں چاہیے، اور طبی اعتبار سے بھی یہ نقصان دہ ہے۔

10۔ نبی کریم ﷺ بدوی کے ساتھ بڑی شفقت، پیار اور محبت سے پیش آئے۔ حالانکہ اس نے مسجد میں پیشاب کرنے جیسی نازیبا حرکت کا ارتکاب کیا تھا۔ اور اسی عالی اخلاق کا حکم ہر مسلمان کو ہے۔

11۔ نبی کریم ﷺ کی وسعت نظر اور لوگوں کی طبیعتوں کی پہچان بہت عمدہ واعلیٰ تھی۔

12۔ تہذیب و تمدن سے ناآشنائی جہالت اور گنوار پن کا باعث بنتی ہے۔

طہارت کی کتاب، مذی وغیرہ کے متعلق

حدیث نمبر:27

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ - رضي الله عنه - قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «الْفِطْرَةُ خَمْسٌ: الْخِتَانُ، وَالاسْتِحْدَادُ، وَقَصُّ الشَّارِبِ، وَتَقْلِيمُ الأَظْفَارِ، وَنَتْفُ الإِبِطِ.»

(رواه البخاري، كتاب اللباس، باب قص الشارب، برقم 5889، وباب تقليم الأظفار، برقم 5891، ومسلم، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، برقم 257]

حدیث مبارکہ کا سلیس ترجمہ

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے ہیں:"فطرتی عمل پانچ ہیں: ختنے کروانا، زیر ناف ریزر استعمال کرنا، مونچھیں کترنا، ناخن کاٹنا،، زیر بغل بال نوچنا۔"(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حدیث مبارکہ کے بعض الفاظ کے معانی

1:الْفِطْرَةُ: طبعی عادت۔

2۔خَمْسٌ: پانچ۔

3۔الْخِتَانُ: ختنے کروانا۔

4:الاسْتِحْدَادُ:استرا یابلیڈ وغیرہ استعمال کرنا۔

5:قَصُّ الشَّارِبِ:مونچھوں کو کترنا۔

6:تَقْلِيمُ الأَظْفَارِ:ناخن تراشنا۔

7:نَتْفُ الإِبِطِ:بغل کے بال نوچنا۔

حدیث سے حاصل ہونے والے بعض مسائل واحکام

1۔ انسان کی کچھ چیزوں اور اعمال کا فطرت سے تعلق ہونا۔ فطرت پر عمل کرنے سے اللہ راضی ہوتے ہیں اور انسان کو طبی وغیرہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

2۔ فطرت کو ترک کرنے کے طبی نقصانات بھی ہیں۔

3۔ اسلام کی حقانیت کے دلائل میں سے ایک اس کا فطرت کے مطابق ہونا ہے اور اس کا اپنے ماننے والوں کو فطرت اختیار کرنے کا حکم و ترغیب دینا ہے۔

4۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر اچھا کام کیا جائے اور ہر برے کام سے اجتناب کیا جائے۔

5۔ دین اسلام نظافت، پاکیزگی اور طہارت اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

6۔ ناخن بڑھانا فطرت کے منافی عمل ہے اس سے ہر مسلمان مرد اور عورت کو اجتناب کرنا چاہیے۔ اور اس کی مخالفت کی وجہ سے انسان جہاں اللہ و رسول کا نافرمان قرار پائے گا وہاں اس کو کئی طبی نقصانات بھی ہوں گے۔

7۔ زیر ناف بالوں کی صفائی کا اہتمام ہر مسلمان بالغ کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بھی کئی طبی فوائد ہیں۔

8۔ مونچھوں کا بلکل نہ کترانا یا بہت بڑی بڑی رکھنا غیر فطری عمل ہے، آتش پرست اس کے عادی تھے، مسلمانوں کو ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔

9۔ بغلوں کے بال اکھیڑنا فطرت میں ہے۔ اگر اکھیڑنا مشکل ہو تو کسی بھی چیز سے ان کو مونڈھا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا مقصود صفائی و ستھرائی ہے۔ البتہ اکھیڑنا افضل ہے کیونکہ حدیث میں اکھیڑنے کا ذکر ہے۔

☆☆☆

علامہ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عزفو القلوب عن الشواغل كلها قد فرغوها من سوى الرحمٰن

"مخلص مسلمانوں، نے اللہ کے علاوہ تمام چیزوں سے اپنا دل فارغ اور خالی کر لیا۔"

حركاتهم وهمومهم وعزومهم لله لا للخلق والشيطان

"ان کے حرکات، افکار اور ارادے اللہ عزوجل کے لئے ہیں نہ کہ مخلوق اور شیطان کے لئے۔"

(تذکیر الانسان بعداوۃ الشیطان:40)

کر کے پھر بیدار ہم کو زندگی دیتا ہے کون؟

خاک کے پتلے کو علم و آگہی دیتا ہے کون؟
نیند کی آغوش میں آسودگی دیتا ہے کون؟
احسنِ تقویم کی دے کر اسے شانِ عظیم
ظلمتوں کو چیرتی ہے کیسے سورج کی کرن
خشک ٹہنی کی طرح جب گھٹ کے ہو جاتا ہے چاند
پھوٹتے ہیں ایک ہی وہ شاخ سے دونوں مگر
کون جگنو کو لڑاتا ہے اندھیری رات سے
مردہ دل کو کر کے القا مژدۂ لاتقنطوا
کون کرتا ہے ہماری ہر خطا سے درگزر
کون کرتا ہے عطا عاشق کے دل کو اضطراب
اوک بھر مانگیں تو زم زم کون کرتا ہے عطا
کون سنتا ہے دعائے نیم شب عارف تری

دل کو ایمان ویقیں کی روشنی دیتا ہے کون؟
کر کے پھر بیدار ہم کو زندگی دیتا ہے کون؟
جو ہر انسان کو پاکیزگی دیتا ہے کون؟
روشنی کو تیرگی پر برتری دیتا ہے کون؟
رفتہ رفتہ اس کو پھر سے چاندنی دیتا ہے کون؟
خار کو سختی تو گل کو نازکی دیتا ہے کون؟
کرمکِ کمزور کو تابندگی دیتا ہے کون؟
اپنی رحمت کی نوید سرمدی دیتا ہے کون؟
توبہ کرنے پر ثوابِ بندگی دیتا ہے کون؟
حسن کو ناز واداۓ دل بری دیتا ہے کون؟
آگ لینے جائیں تو پیغمبری دیتا ہے کون؟
حرف پُر تاثیر وچشمِ شبنمی دیتا ہے کون؟

خواجہ محمد عارف، برمنگھم

18۔ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی لندن میں آمد

میں اپنے حالات زندگی کی اولین اقساط بزبان انگریزی میں تحریر کر چکا ہوں کہ زمانہ طالب علمی میں میرا ڈاکٹر اسرار احمد ؒ سے کیسے ربط قائم ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اپنی ایک پرانی تحریر سے چند اقتباس پیش کرتا ہوں:

یہ 1961ء کی بات ہے جب ابا جان (مولانا عبد الغفار حسن ؒ) کے حکم اور ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی خواہش پر میں لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کو داغِ مفارقت دے کر منٹگمری (حال ساہیوال) میں ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ قرآن ہوسٹل میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس ہوسٹل کے قیام کا مقصد تھا کہ کالج اور یونیورسٹی میں زیر تعلیم طلبہ کو عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ علومِ اسلامیہ سے بھی واقفیت بہم پہنچائی جائے اور اس غرض سے ڈاکٹر صاحب نے ابا جان کو بطور معلم و مربی وہاں آنے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ میں بطور ہراول دستہ پہلے چلا آیا تھا۔

میں ابھی خود طلب علم کے مرحلہ سے گزر رہا تھا کہ میری پیشانی پر فاضل عربی کا تمغہ مجھے معلم عربی کی حیثیت سے متعارف کرا چکا تھا۔ ہوسٹل میں میرا کام تھا کہ وہاں پر موجود طلبہ کو عربی پڑھاؤں اور اپنے فارغ اوقات میں بی اے (انگریزی) کی تیاری کروں۔ اس ہوسٹل کے مکین صرف پانچ طلبہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے برادرِ خورد ابصار احمد، ان کے ابن عم مظفر احمد، صلاح الدین، عبد الغنی اور ہمایوں۔ ہم نو وارد ان ہوسٹل کا برادرم وقار احمد سے بھی یارانہ رہا جو اپنی خاموشی لیکن دل آویز شخصیت کی بنا پر ہر دلعزیز رہے۔ یہاں منتقل ہونے سے قبل چند دن ڈاکٹر صاحب کے مکان کی بیٹھک میں بھی مقیم رہا، جہاں عارف اور عاکف کھیلتے کودتے اکثر آ نکلتے لیکن ڈاکٹر صاحب کا ایک اشارہ انہیں دوبارہ اندر کی راہ دکھا دیتا۔

باعتبار عمر ہوسٹل کے ساتھیوں سے میرا کوئی زیادہ تفاوت نہ تھا۔ میں اپنی عمر کے 19 سال میں تھا اور میرے یہ سارے رفیق میٹرک کرنے کے بعد کالج کی زندگی کا آغاز کر چکے تھے لیکن عربیت اور مولویت کا جامہ اوڑھنے کی بنا پر میری بزرگی ہر حال میں قائم تھی، اُدھر ڈاکٹر صاحب کا جلال اور دبدبہ بھی ہم سب پر قائم تھا۔ یہ عقدہ تو بہت بعد میں کھلا کہ ان میں اور مجھ میں صرف 10 سال کا فرق ہے، وہ خود بھی عربی پڑھنے کے خواہاں تھے لیکن ان کی سیال طبیعت کسی ایک درسی کتاب کی تنگنائیوں میں محدود ہونے سے بالا تھی۔ وہ آتے تو ایک فرشی نشست جم جاتی۔ پرانے طرز کی بڑی بڑی گول 'اسپولز' پر مشتمل ٹیپ ریکارڈر آن ہو جاتا جس میں قاری عبد الباسط اپنی ساحرانہ قراءت کا جادو جگاتے نظر آتے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی لیٹے، کبھی بیٹھے، سر دھنتے اور قاری عبد الباسط کی بلائیں لیتے۔ ڈاکٹر صاحب سے میرا یہ اولین تعارف تھا جو پھر اگلے 49 سال، میری لوحِ دماغ پر نت نئے نقوش بھرتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا پہلا درس قرآن بھی وہیں سنا اور وہاں کی ایک مسجد میں ان کا ایک خطبہ جمعہ بھی۔

باعتبار عمر ہوسٹل کے ساتھیوں سے میرا کوئی زیادہ تفاوت نہ تھا۔ میں اپنی عمر کے 19 سال میں تھا اور میرے یہ سارے رفیق میٹرک کرنے کے بعد کالج کی زندگی کا آغاز کر چکے تھے لیکن عربیت اور مولویت کا جامہ اوڑھنے کی بنا پر میری بزرگی ہر حال میں قائم تھی، اُدھر ڈاکٹر صاحب کا جلال اور دبدبہ بھی ہم سب پر قائم تھا۔ یہ عقدہ تو بہت بعد میں کھلا کہ ان میں اور مجھ میں صرف 10 سال کا فرق ہے، وہ خود بھی عربی پڑھنے کے خواہاں تھے لیکن ان کی سیال طبیعت کسی ایک درسی کتاب کی تنگنائیوں میں محدود ہونے سے بالا تھی۔ وہ آتے تو ایک فرشی نشست جم جاتی۔ پرانے طرز کی بڑی بڑی گول 'اسپولز' پر مشتمل ٹیپ ریکارڈر آن ہو جاتا جس میں قاری عبد الباسط اپنی ساحرانہ قراءت کا جادو جگاتے نظر آتے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی لیٹے، کبھی بیٹھے، سر دھنتے اور قاری عبد الباسط کی بلائیں لیتے۔ ڈاکٹر صاحب سے میرا یہ اولین تعارف تھا جو پھر اگلے 49 سال، میری لوحِ دماغ پر نت نئے نقوش بھرتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا پہلا درس قرآن بھی وہیں سنا اور وہاں کی ایک مسجد میں ان کا ایک خطبہ جمعہ بھی۔

وہ جب رسول اللہ ﷺ سے منسوب اس جامع الکلم خطبہ کو اپنی گرجدار آواز کے زیر و بم کے ساتھ دہراتے تو دل دہل جاتے:

«إن الرائد لا يكذب أهله والله لو كذبت الناس جميعًا ما كذبتكم

والله لو غررت الناس جميعًا ما غررتكم
وإني رسول الله إليكم خاصة وإلى
الناس عامة
والله لتموتن كما تنامون
ولتبعثن كما تستيقظون
ولتحاسبن بما تعملون
ولتجزون بالإحسان إحسانًا وبالسوء
سوءًا
وإنها لجنة أبدًا، أو لنار أبدًا»

"قوم کا پیش رَو اپنے لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔
اللہ کی قسم! اگر میں تمام لوگوں سے بھی جھوٹ بولوں تو تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔
اللہ کی قسم! اگر میں تمام لوگوں کو بھی دھوکہ دوں تو تمہیں دھوکہ نہ دوں گا۔
میں خاص طور پر تمہاری طرف اللہ کا پیغامبر ہوں اور عمومی طور پر تمام لوگوں کے لیے
اللہ کی قسم! جیسے تم (روزانہ) سوتے ہو ویسے ہی (ایک دن) مر جاؤ گے۔
اور جیسے (سونے کے بعد) اٹھتے ہو، ویسے ہی (قیامت کے دن) اٹھو گے۔
اور پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو، اس کا حساب دو گے۔
اور پھر اگر اچھے کام کیے ہیں تو اچھا بدلہ ملے گا اور اگر برے کام کیے ہیں تو برا بدلہ ملے گا اور یہ (بدلہ) ہمیشہ ہمیش کی جنت ہو گا یا ابدی جہنم۔" (یہ خطبہ سیرت کی کتب اور جمہرۃ خطب العرب سے لیا گیا ہے)

ہر شخص اپنی زندگی میں دوسروں سے بہت کچھ سیکھتا ہے، مجھے آج بھی یہ احساس ہے کہ میں نے اس نابغۂ عصر ہستی سے کیا کچھ استفادہ نہیں کیا۔ ان کا زورِ خطابت، قرآن سے ان کا بے پایاں شغف، تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر، اسلامیانِ پاکستان کے مسائل کا وہ گہرا نبض شناس، مغربی افکار کا وہ بے رحم ناقد، یہ سارے دریچے آہستہ آہستہ میرے سامنے واہوتے رہے اور میں ان میں جھانکنے کی کوشش کرتا رہا۔ غالباً تین ماہ کے بعد ابا جان بھی منٹگمری منتقل ہو گئے اور یوں مجھے بی اے کی تیاری کے لیے فراغت نصیب ہو گئی۔ البتہ وہاں کے مدرسہ رشیدیہ میں 2 اسباق، نور الانوار (اصول فقہ میں) اور مسایرۃ مع مسامرۃ (علم الکلام میں) بھی جاری رکھے۔

1962ء میں بی اے (انگریزی) سے فارغ ہوتے ہی جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ جانے کے اسباب پیدا ہو گئے۔ میں منٹگمری سے رخت سفر باندھ کر کراچی آ پہنچا جہاں پاسپورٹ اور ویزا کے حصول میں ایک دو ماہ کا قیام ناگزیر تھا۔ اب دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب منٹگمری چھوڑ چھاڑ کر کراچی منتقل ہو گئے ہیں جہاں وہ اپنے برادرِ بزرگ اظہار قریشی کی تعمیراتی کمپنی کے ڈائریکٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ بالآخر میں عازم حجاز ہوا۔ سعودی سفیر نے پاکستان سے مدینہ یونیورسٹی کے پہلے دستے کو، جس میں مجھ سمیت 18 طلبہ شامل تھے، سفینہ حجاج سے جدہ روانہ کر دیا۔ یہ جہاز حاجیوں کو جدہ سے واپس لا چکا تھا اور مزید حاجیوں کو لانے کے لیے دوسرا پھیرا کر رہا تھا۔

مدینہ منورہ میں اگلے چار سال درس و مذاکرہ میں گزرے۔ 1966ء میں جامعہ سے فراغت اور اس کے اگلے سال مشرقی افریقہ کے ملک کینیا میں میری بحیثیت مبعوث آمد، مجھے پاکستان اور اہل پاکستان سے دور لے جاتی گئی، البتہ اپنی سالانہ چھٹی میں کبھی مدینہ منورہ (بغرض ملاقات والدین) اور کبھی پاکستان جانا لگا رہتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد سے تعلقات میں مزید استواری آتی گئی۔

میں نے نیروبی (کینیا) کے قیام کے دوران دو مختصر کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ایک مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب 'اشتراکیت اور اسلام' کا اور دوسرا ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب 'مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' کا۔ یہ دونوں مقالات ندوۃ العلماء 'لکھنو' کے عربی جریدہ 'البعث الاسلامی' میں بالاقساط شائع ہوئے۔ ان دنوں جمال عبد الناصر کی فکر اشتراکیت کو عربوں میں خوب پذیرائی حاصل تھی، اس لیے 'اشتراکیت اور اسلام' کو عربی جامہ پہنانے کی سوجھی اور ڈاکٹر صاحب کے کتابچہ کو عربی میں منتقل کرنے کی تحریک میں وہ جذبہ کام کر گیا جو ڈاکٹر صاحب کی تحریر وتقریر کی ساحرانہ تاثیر کا مرہونِ منت تھا۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ عرب قارئین میں اس عربی کتابچے نے ڈاکٹر اسرار احمد کو روشناس کرانے میں مدد دی۔

ڈاکٹر صاحب نے تنظیم اسلامی قائم کی اور ہر داعی الی اللہ کی طرح انہوں نے "مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللهِ" کا نعرہ لگایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک طویل مراسلہ میں مجھے تحریک سے وابستہ ہونے کی دعوت دی اور پھر اسی شدومد کے ساتھ ان کے ایک انتہائی مخلص رفیق قاضی عبد القادر صاحب نے بھی اس نامہ وپیام کو دو آتشہ بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ڈاکٹر صاحب کی تحریک بیرون پاکستان (برطانیہ اور امریکہ وغیرہ) میں برگ وبار لانے کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ میں تذبذب کے عالم میں تھا، ابا جان سے بذریعہ مراسلت مشورہ کیا، ابا جان جماعت اسلامی کو خیر باد کہنے کے بعد سے تنظیم سازی اور جماعت بازی کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ میری برطانیہ کی جماعت اہل حدیث سے وابستگی کے وقت بھی ان کا یہی مشورہ تھا کہ جہاں بھی رہو، دین کا کام کرتے رہو، قال اور قال الرسول کی مجلسیں برپا کرتے رہو، لیکن کسی تنظیم کا حصہ بن کر باہمی چپقلش اور نزاعات میں اپنا وقت برباد کرنے سے بہتر ہے کہ مثبت طور پر دین کی دعوت پیش کرتے رہو۔ مجھے بیعت کے مسئلہ میں بھی شرحِ صدر نہ تھا اور اب بھی

میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ بیعت خلافت کے علاوہ تمام دوسری بیعتیں میزانِ قرآن و سنت پر پوری نہیں اترتیں۔ میں نے اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے اپنا معذرت نامہ ارسال کر دیا۔ گو میں رسمی طور پر تنظیم اسلامی میں شامل نہیں ہوا، لیکن میثاق اور ندائے خلافت کے صفحات پر تنظیم اسلامی کی کاوشوں کو ہمیشہ بنظر تحسین دیکھتا رہا۔ پاکستان کے دگرگوں حالات میں جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی اور جماعت اہل حدیث کی جدوجہد کو میں نے ہمیشہ سراہا اور ان خدام دین کے لیے بارہا دعا کی۔

یہ ڈاکٹر صاحب کی وسعت ظرفی ہے کہ انہوں نے میرے اس معذرت نامے کے باوجود باہمی تعلقات میں کوئی آنچ نہ آنے دی۔ ان کی اکثر تحریریں جو کتابی شکل اختیار کر چکی ہیں، ملاقات کے موقع پر عنایت فرماتے، تدبر قرآن جلد دوم کا وہ نسخہ میرے پاس محفوظ ہے، جو انہوں نے اپنے دستخط کے ساتھ عنایت فرمایا تھا۔ اس پر 7 ستمبر 1971ء کی تاریخ مرقوم ہے۔

یہ جون 1981ء کی آخری تاریخوں کا واقعہ ہے، جب ڈاکٹر صاحب لندن تشریف لائے اور مجھے ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔

لندن میں ان کے پہلے جلسہ عام کی تقریب کا اہتمام میرے اپنے ادارے قرآن سوسائٹی کے زیر انتظام ہوا۔ قیام میرے ہاں تھا۔ میں شمالی لندن کے جس علاقہ (وُڈ گرین) میں مقیم تھا، وہاں اس وقت تک کسی مسجد کا قیام عمل میں نہیں آ سکا تھا۔ ہمارے قریب ہی ایک صاحب نے دو منزلہ مکان کی نچلی منزل کا کمرہ پنج وقتہ نماز ادا کرنے کے لیے فراہم کیا ہوا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے نماز فجر کی امامت کے لیے کہا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے معمول کے مطابق پورے انہاک اور بلند آواز سے قراءت میں محو ہو گئے۔ پڑوس میں کسی انگریز کی رہائش گاہ تھی، دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی، اب جو ڈاکٹر صاحب کی آواز کا آہنگ اس کی نیند میں خلل انداز ہوا تو اس نے اپنی جانب سے دیوار کو زور زور سے تھپتھپانا شروع کیا۔ ہم مقتدیوں کو تو اس آفت ناگہانی کا ادراک ہو گیا لیکن ڈاکٹر صاحب کو لندن کے اس دستورِ نو کا کیسے علم ہوتا ہے۔ پہلی رکعت کے رکوع و سجود کا وقفہ جونہی ختم ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ قراءت کا آغاز کیا تو اس کا پارہ بھی سوا نیزے تک جا پہنچا، گھر سے نکلا اور ہمارے عارضی مصلی کے دروازے پر آ کر جوتوں کو پھینکتا اور مغلظات بکتا رہا، پولیس کو بھی بلا لیا لیکن پولیس کے آنے تک طوفان تھم چکا تھا اور ہم نمازی آہستگی سے رخصت ہو رہے تھے۔ اس لیے پولیس کسی جرم کی شہادت نہ پا سکی اور یوں یہ معاملہ اس کی خفیف سی تنبیہ پر ختم ہو گیا۔ اب اس علاقہ میں ایک چھوڑ چار مسجدیں قائم ہو چکی ہیں، جہاں مقامی کونسل کی ہدایات کے مطابق آدابِ جوار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

یہ تحریر چونکہ فروری 2022ء میں قلمبند کی جا رہی ہے تو کہتا چلوں کہ اب ڈاکٹر صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اپریل 2014ء میں وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔

مسلکی اعتبار سے ان کی بعض آراء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ہر صاحب علم کے اپنے تفردات رہے ہیں لیکن کسی بھی شخص کو جانچنے کے لیے چند معیار ملحوظِ خاطر رہنے چاہئیں جن میں کتاب و سنت سے اس کی وابستگی اور شیفتگی، اپنی اولاد کی دینی خطوط پر تعلیم و تربیت، اپنی نجی زندگی میں تقویٰ اور طہارت اور اسلام کی سربلندی کے لیے مسلسل جدوجہد اور محنت سرفہرست ہیں، ڈاکٹر صاحب کو ان تمام باتوں سے حظ وافر ملا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور دین اسلام کی خاطر ان کی مساعی جمیلہ کو ان کے لیے توشۂ آخرت بنا دے۔

19۔ مجلس عمل اور مجلس شریعت اسلامیہ کا قیام

یہ 1981ء، 1982ء کی بات ہے جب انگلینڈ کے ایک مذہبی طبقہ کی طرف سے مسلکی اختلاف اور سیاسی عناد کی بنا پر یہ تحریک شروع کی جا چکی تھی کہ ارضِ حجاز جسے مکہ اور مدینہ اکی میزبانی کا شرف حاصل ہے، عالم اسلام کی مجموعی تولیت میں دے دیا جائے اور اس مقصد کے لیے ایک کانفرنس کا بھی انعقاد کیا گیا۔

اس بے ہنگم تجویز کی نامعقولیت کو آشکار کرنے کے لیے برطانیہ کے اہل علم ودانش، قرآن وسنت کی دعوت کے علمبردار علماء و مشائخ اور فکر سلیم کے پاسبان حضرات کی جانب سے ایک مجلس عمل قائم کی گئی اور اتحاد ملت کا نعرہ بلند کیا گیا اور اس سلسلے میں برمنگھم شہر کی جامع مسجد کے وسیع وعریض ہال میں ایک عظیم الشان کانفرنس بھی منعقد کی گئی۔

اس کانفرنس کے اسٹیج پر ان تمام مسالک اہل سنت

یہ 1981ء، 1982ء کی بات ہے جب انگلینڈ کے ایک مذہبی طبقہ کی طرف سے مسلکی اختلاف اور سیاسی عناد کی بنا پر یہ تحریک شروع کی جا چکی تھی کہ ارضِ حجاز جسے مکہ اور مدینہ اکی میزبانی کا شرف حاصل ہے، عالم اسلام کی مجموعی تولیت میں دے دیا جائے اور اس مقصد کے لیے ایک کانفرنس کا بھی انعقاد کیا گیا۔
اس بے ہنگم تجویز کی نامعقولیت کو آشکار کرنے کے لیے برطانیہ کے اہل علم ودانش، قرآن وسنت کی دعوت کے علمبردار علماء ومشائخ اور فکر سلیم کے پاسبان حضرات کی جانب سے ایک مجلس عمل قائم کی گئی اور اتحاد ملت کا نعرہ بلند کیا گیا اور اس سلسلے میں برمنگھم شہر کی جامع مسجد کے وسیع وعریض ہال میں ایک عظیم الشان کانفرنس بھی منعقد کی گئی۔

کے متعدد علماء موجود تھے جو اہل اہوا اور بدعت کی ریشہ دوانیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اگر دار الافتاء کی طرف سے مجھے نمائندگی کا شرف حاصل تھا تو مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ کی جانب سے مولانا محمود احمد میرپوری نے نمائندگی کا بھرپور حق ادا کر دیا۔

اس موقع پر والد مکرم کا ایک مضمون 'سنت اور اتحاد ملت' کے عنوان سے ایک کتابچے کی شکل میں عام لوگوں کے لیے دستیاب رہا۔

میرے ذہن میں اس وقت اسلامی شریعت کونسل کے نام سے ایک تنظیم کا خاکہ انگڑائیاں لے رہا تھا۔ ایک ایسی تنظیم جو برطانیہ کے مسلمانوں کے لیے تمام دینی مسائل میں ان کی رہنمائی کر سکے، فقہی سوالات کا قرآن وسنت اور اجتہادات ائمہ کی روشنی میں جواب مہیا کر سکے اور مسلمان خاندانوں کے عائلی نزاعات میں ثالثی کا فریضہ انجام دے سکے۔ میں اپنے خیالات تحریری شکل میں ائمہ، مدیران مساجد ومراکز کے سامنے پیش کر چکا تھا۔ ضرورت تھی کہ اسے عملی جامہ پہنایا جائے، چنانچہ کانفرنس کے اختتام پر 10 اسلامی مراکز ومساجد کا ایک نمائندہ اجلاس بھی بلایا گیا، جس میں اس تجویز کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا اور اسکے بال و پر کو ایک لڑی میں پرونے اور اس کے خدوخال کو نکھارنے پر توجہ دی گئی۔

اس تجویز پر صاد کیا گیا اور اس بات پر بھی اتفاق کیا گیا کہ اس تنظیم کے صدر اور سیکرٹری کو بھی منتخب کر لیا جائے۔ اس موقع پر علامہ خالد محمود اپنی کرسی سے اٹھے، میرے سر پر ہاتھ رکھا اور گویا ہوئے کہ ہم نے اپنی سی جدوجہد تمام کر لی ہے، اس لیے میں صدارت کے لیے لندن کی مرکزی مسجد یعنی ریجنٹ پارک کے اسلامک سنٹر کے امام وخطیب ڈاکٹر سید متولی الدرش اور نظامت کے لیے مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ مولانا محمود احمد میرپوری کا نام تجویز کرتا ہوں۔ ان کی اس تجویز کو بالاتفاق منظور کیا گیا اور یوں اسلامی شریعت کونسل کی کاروائیوں کا آغاز عمل میں آ گیا۔

1982ء سے لے کر تا دم تحریر (2022ء) 40 سال کا عرصہ گذر چکا ہے، کونسل اب ایک تناور درخت بن چکی ہے لیکن اس طویل عرصہ میں جن نشب وفراز اور مدّوجد سے وہ گذری، اس کا تذکرہ اس آپ بیتی کا حصہ بنتا رہے گا۔

20۔ مسجد پکاڈلی

پکاڈلی لندن کا دل کہلاتا ہے، غالباً اس لیے کہ یہاں کا سارا ماحول تھیٹر، سینما، میوزیم وغیرہ سے عبارت ہے۔

ایک دن اس علاقے کی واحد مسجد کا قصد کیا۔ میں پکاڈلی کی تنگنائیوں میں راستہ تلاش کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا تو بعض دوکانوں کے جھروکوں اور شیشوں سے نامناسب (بلکہ شرم وحیا کے منافی) شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے نقش ونگار، مصنوعی صنفی اعضا کے اشتہارات اور تماشاہائے صبح وشام کے اعلانات جگہ جگہ نظر آئے۔ انکشاف ہوا کہ معروف معنوں میں یہ بازار حسن نہیں ہے لیکن اس بازار کا ایک شہوانی باب ہے جو عیاش اور اوباش تماش بینوں کے جذبات کو بہلانے کے اسباب عیش مہیا کرتا ہے۔

میں تیز قدم بڑھاتے ہوئے ایک تنگ سی سڑک کے اس دو منزلہ یا سہ منزلہ مکان تک پہنچ گیا جس میں ایک مسجد قائم تھی۔ یہ ایک تنگ سا مکان تھا جس کی نچلی منزل میں وضو خانہ، گراؤنڈ فلور پر مصلی اور پہلی منزل میں بچوں کی تعلیم کے لیے جز وقتی مدرسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

یہ میرا اس مسجد کا پہلا اور آخری دیدار تھا۔ مسجد کے امام اور خطیب سے ملاقات ہوئی۔ یہ معلوم کر کے خوش ہوئی کہ وہ تو میرے ایک دیرینہ شناسا نکلے، احرار الزمان میرے ایام مدینہ کے دوران جامعہ کے طالب علم رہے تھے۔

ان کے بارے میں اتنا تو معلوم تھا کہ وہ سقوط ڈھاکہ کے بعد بنگلہ دیش میں اپنی نئی دنیا بسا چکے تھے لیکن کن حالات میں انہیں یہاں آنا پڑا وہ میرے علم میں نہ تھا۔ ان سے مختصر سی ملاقات رہی۔ میں نے پوچھا: حضرت! یہ آپ کو اس جائے تماشا اور عالم شراب وکباب میں مسجد قائم کرنے کی کیا سوجھی کہ جہاں ایک مسلمان کو آنے جانے میں بھی تکلف کا سامنا کرنا پڑے تو انہوں نے جو جواب دیا وہ آج تک میرے نہاں خانہ دل میں گونج رہا ہے۔

کہنے لگے: آپ یہ بتائیں کہ موم بتی کہاں جلائی جاتی ہے؟

میں ان کی ہمت کو داد دیتا ہوں کہ انہوں نے اندھیرے میں ایک روشنی کی کرن چمکا رکھی ہے، اللہ کرے کہ یہ گھر آباد رہے۔

خیال رہے کہ ہمارے بنگالی بھائیوں نے برطانیہ کے طول وعرض میں ریسٹوران قائم کرنے کا اعزاز حاصل کر رکھا ہے اور پھر ہر ریسٹوران کے قرب وجوار میں انہیں کرائے یا کونسل کے مکانات کی بھی تلاش رہتی ہے۔ گو ان میں سے اکثر صرف اپنے کام یا ملازمت کے ہو کے رہ جاتے ہیں لیکن ان میں ایسے نفوس قدسیہ کی کمی نہیں جو تاریکیوں میں چراغ جلانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

☆☆☆

انبیاء کرام علیہم السلام سے جو خلاف عادت غیر معمولی کام سرزد ہوتے ہیں انہیں معجزات کہا جاتا ہے اور غیر انبیاء سے جو غیر معمولی کام سرزد ہوتے ہیں انہیں کرامات کہا جاتا ہے۔

اولیاء اللہ میں انبیاء کے بعد سب سے پہلے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام و مرتبہ ہے، ان کے بعد غیر صحابہ کا مقام و مرتبہ ہے۔

صحابہ کون ہیں؟

صحابی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ایمان کی حالت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہوں اور ایمان کی حالت میں انہیں موت واقع ہوئی ہو۔

اولیاءاللہ کون ہیں؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ 0 الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ﴾

"یاد رکھو! اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں، وہ ہیں جو ایمان لائے اور پرہیز گار ہوئے۔" (سورۃ یونس:62۔63)

اولیاء ولی کی جمع ہے جس کے معنیٰ لغت میں قریب کے ہیں، اس اعتبار سے اولیاء اللہ کے معنیٰ ہوں گے، وہ سچے اور مخلص مؤمن جنہوں نے اللہ کی اطاعت اور معاصی سے اجتناب کر کے اللہ کا قرب حاصل کر لیا۔ اسی لیے اگلی آیت میں خود اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی تعریف ان الفاظ سے بیان فرمائی، جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور ایمان و تقویٰ ہی اللہ کے قرب کی بنیاد اور اہم ترین ذریعہ ہے۔ اس لحاظ سے ہر مؤمن متقی اللہ کا ولی ہے۔ لوگ ولایت کے لیے اظہار کرامت ضروری سمجھتے ہیں اور پھر وہ اپنے بنائے ہوئے ولیوں کے لیے جھوٹی سچی کرامتیں مشہور کرتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کرامت کا ولایت سے چولی دامن کا ساتھ ہے نہ اس کے لیے شرط۔ یہ ایک الگ چیز ہے اگر کسی سے کرامت ظاہر ہو جائے تو اللہ کی مشیت ہے، اس میں اس بزرگ کی مشیت شامل نہیں ہے لیکن کسی متقی مؤمن اور متبع سنت سے کرامت کا ظہور ہو یا نہ ہو۔ اس کی ولایت میں کوئی شک نہیں۔ خوف کا تعلق مستقبل سے ہے اور غم (حزن) کا ماضی سے، مطلب یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے زندگی خداخوفی کے ساتھ گزاری ہوتی ہے اس لیے قیامت کی ہولناکیوں کا اتنا خوف ان پر نہیں ہوگا، جس طرح دوسروں کو ہوگا، بلکہ وہ اپنے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے اللہ کی رحمت و فضل خاص کے امیدوار اور اس کے ساتھ حسن ظن رکھنے والے ہوں گے۔ اسی طرح دنیا میں وہ جو کچھ چھوڑ گئے ہوں گے، یا دنیا کی لذتیں انہیں حاصل نہ ہو سکی ہوں گی، ان پر انہیں کوئی حزن وملال نہیں ہوگا۔ ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ دنیا میں جو مطلوبہ چیزیں انہیں نہ ملیں، اس پر وہ غم و حزن کا مظاہرہ نہیں کرتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ سب اللہ کی قضاوتقدیر ہے۔ جس سے ان کے دلوں میں کوئی ھمّ وکدر پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے دل قضائے الٰہی پر مسرور و مطمئن رہتے ہیں۔ (احسن البیان، مطبوعہ دار السلام، لاہور)

اولیاء کے لیے اللہ کی خوشخبریاں

ان آیات کے فوراً بعد اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے:

﴿لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (سورۃ یونس:64)

"ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی خوش خبری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی باتوں میں کچھ فرق ہوا نہیں کرتا۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔"

دنیا میں خوشخبری سے مراد رؤیائے صالحہ ہیں یا وہ خوش خبری ہے جو موت کے وقت فرشتے ایک مؤمن کو دیتے ہیں، جیسا کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ (احسن البیان)

قرآن مجید سے کرامات کا ثبوت

ویسے تو قرآن مجید میں کرامات کے کئی واقعات ہیں، مگر ہم اختصار کے لیے صرف ایک واقعہ پر اکتفاء کرتے ہیں۔ وہ واقعہ سیدہ مریم بنت عمران علیہا السلام کا ہے کہ سیدہ مریم کی والدہ حضرت حنّا علیہا السلام حمل سے تھیں، تو انہوں نے اللہ سے یہ نذر مانی تھی کہ اے اللہ میرے پیٹ میں جو ہے میں اسے تیرے گھر بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی اور انہیں امید تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں لڑکا عطا فرمائے گا، مگر اللہ پاک نے خلاف توقع انہیں بیٹی عطا فرمائی، جس کا نام مریم رکھا گیا، نذر کے مطابق سیدہ حنّا علیہا السلام نے بی بی مریم کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے وہاں کے متولیوں کے حوالہ کر دیا، ان متولیوں اور ذمہ داروں میں بی بی مریم کے خالو حضرت زکریا علیہ السلام بھی تھے، انہوں نے مریم کی کفالت کی ذمہ داری قبول کر لی اور سیدہ مریم علیہا السلام کے لیے ایک حجرہ مختص کر دیا گیا، ان کے پاس سوائے حضرت

زکریاعلیہ السلام کے اور کوئی نہیں جا سکتے تھے، حضرت زکریاعلیہ السلام جب مریم کے حجرہ میں جاتے تو وہاں بے موسم کے پھل نظر آتے تھے، تو انہیں تعجب ہوتا اور سیدہ مریم سے پوچھتے کہ یہ پھل کہاں سے آئے ہیں؟ تو ان کا جواب ہوتا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے! اس پر حضرت زکریاعلیہ السلام کو تعجب ہوتا کہ اگر اللہ تعالیٰ اس لڑکی کو بے موسم کے پھل عطا فرما سکتا ہے تو مجھے بھی بے موسم کے اولاد عطا فرما سکتا ہے، کیونکہ سیدنا زکریاعلیہ السلام اور ان کی زوجہ محترمہ پر بڑھاپا طاری ہو چکا تھا، اور اولاد کی ساری امیدیں ختم ہو چکی تھیں، انہوں نے پھر سے اللہ سے اولاد کے لیے دعا مانگی اور اللہ نے ان کی دعا قبول فرمالی اور انہیں ایک بیٹا عطا فرمایا، اور ان کا نام بھی اللہ ہی نے منتخب فرمایا کہ یہ 'یحییٰ' ہے اور اس سے پہلے دنیا اس نام سے واقف نہ تھی۔ مریم اگرچہ کہ ان کی بھانجی اور بہت کم عمر تھیں مگر وہ اللہ کی ولیہ تھیں کہ ان کو دیکھ کر ایک نبی کے ایمان میں اضافہ ہوا اور اولاد سے مکمل مایوسی کے بعد پھر امید کی کرن پیدا ہوئی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (سورۃ آل عمران:37)

"جب کبھی زکریا ان کے حجرہ میں جاتے تو ان کے پاس روزی رکھی ہوئی پاتے تو وہ پوچھتے، اے مریم! یہ روزی تمہارے پاس کہاں سے آئی؟ وہ جواب دیتیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے، بے شک اللہ جسے چاہے بے شمار روزی دے۔"

حدیث سے کرامت کا ثبوت

ویسے تو احادیث میں کرامت کے بہت سارے واقعات ہیں مگر اختصار کے لیے ہم صرف ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں، بنی اسرائیل میں ایک بہت ہی بڑے عابد اور زاہد آدمی تھے اور وہ ہمیشہ اللہ کی عبادت میں شب و روز گزارتے تھے، ان کا نام جریج تھا۔ مکان میں ایک بالاخانہ تھا، جس میں جریج رہتے تھے اور نیچے کے حصے میں ان کی والدہ محترمہ رہتی تھیں، ماں جب بھی نیچے سے بیٹے کو آواز دیتیں وہ عبادت میں مصروف ہونے کی وجہ سے ماں کو جواب نہیں دیتے تھے، بالآخر تین دن مسلسل ایسا ہی ہوا، تو ماں کے منہ سے بد دعا نکل گئی کہ اللہ تو اسے موت نہ دے جب تک کہ یہ فاحشہ عورتوں کا منہ نہ دیکھ لے۔ ہوا ایسا کہ اس کے آس پاس ایک چرواہا رہتا تھا، اسی نے ایک عورت سے بدکاری کی اور حمل ٹھہر گیا، جب بچہ پیدا ہوا تو اس نے جریج کا نام بتا دیا، لوگ آکر جریج کا حجرہ گرا دیتے ہیں، جریج نے پوچھا، کیا بات ہے، تم میرا حجرہ کیوں گرا رہے ہو؟ لوگوں نے کہا کہ تم نے فلاں عورت سے بدکاری کی ہے اور اس سے تمہارا بچہ پیدا ہوا ہے۔ جریج نے کہا کہ وہ بچہ کہاں ہے؟ لوگ اس عورت کو اور بچہ کو آپ کے پاس لے کر آئے، جریج نے اس بچہ سے پوچھا کہ تیرا باپ کون ہے؟ اس بچہ نے چرواہے کا نام بتا دیا کہ وہ میرا باپ ہے۔ چنانچہ لوگ بہت شرمندہ ہوئے اور جریج کو متبرک سمجھ کر چومنے لگے اور یہ فیصلہ کر لیا کہ جریج کا حجرہ سونے سے بنا دیں گے۔ جریج نے کہا کہ نہیں، جیسا تھا ویسا ہی مٹی سے بنا دو۔ یہ واقعہ تفصیل سے احادیث میں موجود ہے جو جریج کی کرامت پر دلالت کرتا ہے۔ (صحیح بخاری:1206)

اللہ چاہے تو اولیاء اللہ سے کرامت سرزد ہوتی ہے۔ اولیاء کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ کرامت کا اظہار کریں، سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ ولی شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہو، شریعت پر عمل کرنے کے بجائے وہ صرف کرامات دکھاتا رہے اور شریعت کے خلاف عمل پیرا ہو تو وہ شیطانی فعل ہے، کرامت نہیں ہے۔ ہر زمانہ میں ایسے اولیاء الشیاطین رہ چکے ہیں اور آج بھی ہیں، جس کا مقصد شرک و بدعت اور خرافات پھیلانا ہے، وہ ہندوؤں کی طرح گیرو کے کپڑے پہنتے ہیں، نشہ کرتے ہیں اور محرمات کو حلال سمجھتے ہیں۔ العیاذ باللہ

اذان کیسے شروع ہوئی؟

اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وضاحت اور جب تم نماز کے لیے اذان دیتے ہو، تو وہ اس کو مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ ناسمجھ ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

جب تمہیں جمعہ کے دن نماز جمعہ کے لیے پکارا جائے۔ (تو اللہ کی یاد کرنے کے لیے فوراً چلے آؤ۔)

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں تعمیر مسجد نبوی کے بعد سوچا گیا کہ مسلمانوں کو نماز کے لیے وقت مقررہ پر کس طرح اطلاع کی جائے، چنانچہ یہود و نصاریٰ و مجوس کے مروج طریقے سامنے آئے، جو وہ اپنی عبادت گاہوں میں لوگوں کو بلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسلام میں ان سب چیزوں کو ناپسند کیا گیا کہ عبادت الٰہی کے بلانے کے لیے گھنٹے یا ناقوس کا استعمال کیا جائے۔ یا اس کی اطلاع کے لیے آگ روشن کر دی جائے، یہ مسئلہ درپیش ہی تھا کہ ایک صحابی عبد اللہ بن زید انصاری خزرجی رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص ان کو نماز کے وقتوں کی اطلاع کے لیے مروج اذان کے الفاظ سکھا رہا ہے، وہ صبح اس خواب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرنے آئے تو دیکھا گیا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی دوڑے چلے آرہے ہیں اور آپ بھی حلفیہ بیان دیتے ہیں کہ خواب میں ان کو بھی ہو بہو ان ہی کلمات کی تلقین کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان بیانات کو سن کر خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ خواب

بالکل سچے ہیں، اب یہی طریقہ رائج کر دیا گیا، یہ خواب کا واقعہ مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد پہلے سال ہی کا ہے، جیسا کہ حافظ نے تہذیب التہذیب میں بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے سیدنا عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم یہ الفاظ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو سکھا دو ان کی آواز بہت بلند ہے۔ اس حدیث اور اس کے علاوہ اور بھی متعدد احادیث میں تکبیر (اقامت) کے الفاظ ایک ایک مرتبہ ادا کرنے کا ذکر ہے۔ (صحیح بخاری: 603؛ حضرت مولانا محمد داؤد راز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ)

اس حدیث سے سیدنا عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی کرامات واضح ہوئی کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے خواب کو سچے خواب فرمایا اور اس کے مطابق اذان مشروع ہوئی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تواضع کے لیے سمندر نے عنبر مچھلی کو باہر پھینک دیا!

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو بھیجا اور سیدنا ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا تاکہ ہم قریش کے قافلہ سے ملیں اور ہمارے توشے کے لیے ایک تھیلہ کھجور کا دیا اور کچھ نہ ملا تو سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ ہم کو ایک ایک کھجور ہر روز دیا کرتے تھے، سیدنا ابو الزبیر نے کہا کہ میں نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تم ایک کھجور میں کیا کرتے تھے انہوں نے کہا، اس کو چوس لیتے تھے، بچہ کی طرح، پھر اس پر تھوڑا پانی پی لیتے تھے وہ ہم کو سارا دن رات کو کافی ہو جاتا اور ہم اپنی لکڑیوں سے پتے جھاڑتے پھر اس کو پانی میں تر کر کے کھاتے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم سمندر کے کنارے پر گئے وہاں ایک لمبی سی موٹی چیز نمودار ہوئی، ہم اس کے پاس گئے دیکھا تو وہ ایک جانور ہے، جس کو عنبر کہتے ہیں، سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا یہ مردار ہے، پھر کہنے لگے، نہیں ہم اللہ کے رسول ﷺ کے بھیجے ہوئے ہیں اور اللہ کی راہ میں نکلے ہیں اور تم بے قرار ہو، بھوک سے تو کھاؤ، اس کو۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہم وہاں ایک مہینہ رہے اور ہم تین سو آدمی تھے، اس کا گوشت کھاتے رہے یہاں تک کہ ہم موٹے ہو گئے، سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا تم دیکھو، ہم اس کی آنکھ کے حلقہ میں سے چربی کے گھڑے گھڑے بھرتے تھے اور اس میں بیل کے برابر گوشت کے ٹکڑے کاٹتے تھے، آخر سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے ہم میں سے 13 آدمیوں کو لیا تو وہ جب اس کی پسلیوں میں سے اٹھا کر کھڑی کی، پھر سب سے بڑے اونٹ پر پالان باندھی وہ اس کے نیچے سے نکل گیا اور ہم نے اس کے گوشت میں وشائق بنا لیتے توشہ کے لیے (وشائق جمع وشیقہ کی، وشیقہ وہ ابلا ہوا گوشت ہے جو سفر میں رکھتے ہیں) جب ہم مدینہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور یہ قصہ بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا:

”وہ اللہ تعالیٰ کا رزق تھا جو تمہارے لیے اس نے سمندر سے نکالا تھا، اب تمہارے پاس اس کا کچھ گوشت ہے تو ہمیں بھی کھلاؤ۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے اس کا گوشت آپ ﷺ کو بھیجا تو آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، پہلے سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے اس کو مردار کہا، پھر ان کا اجتہاد بدل گیا اور انہوں نے کہا یہ حلال ہے۔ گو مردار ہو کیونکہ وہ مضطر تھے اور مضطر کے لیے مردار بھی حلال ہے، اور حضرت ﷺ نے جو اس کا گوشت مانگا تو ان کے دل کو خوش کرنے کے لیے کیونکہ وہ حلال تھا یا اس لیے کہ وہ خاص اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے اس کو متبرک سمجھا اور اس میں دلیل ہے اس امر کی کہ آدمی کو اپنے دوست سے کوئی شئے مانگنا درست ہے اور یہ سوال حرام نہیں ہے اور اجتہاد جائز ہونے کی یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی اور اس امر کی کہ دریا کا مردہ حلال ہے خواہ وہ خود مر جائے خواہ شکار سے مر جائے اور اہل اسلام نے مچھلی کی حلت پر اجماع کیا ہے۔ ہمارے اصحاب نے مینڈک کو حرام کیا اور مینڈک کے سوا اور جانوروں میں 3 سے زیادہ اقوال ہیں۔

صحیح قول یہ ہے کہ وہ حلال ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مینڈک بھی درست ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مچھلی کے سوا اور کوئی دریا کا جانور درست نہیں ہے۔ اسی طرح وہ مچھلی جو خود مر کر پانی کے اوپر تیر آئے، ہمارے نزدیک اور جمہور علماء کے نزدیک حلال ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حرام ہے اور حرمت کی دلیل میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے جو کہ ضعیف ہے۔ جو کہ استدلال کے لائق نہیں ہے اور ہماری دلیل صحیح ہے۔ (صحیح مسلم: 1935، مع شرح امام نووی رحمۃ اللہ علیہ)

اس حدیث سے بھی ان 300 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کرامت ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہو گئے تھے کس طرح حلال جانور مچھلی عنایت فرمائی جو زندہ اور مردہ دونوں حالتوں میں حلال ہے۔

☆☆☆

امام ابن معتز رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں

لَا تَحْقِرَنّ صَغِيْرَةً

اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصَى

”چھوٹے چھوٹے گناہوں کو حقیر مت سمجھ، بلاشبہ کنکریوں سے مل کر ہی پہاڑ بنتے ہیں۔“

(تذکیر الانسان بعداوۃ الشیطان: 37)

طلاق (divorce) کیا ہے۔ طلاق کا مطلب یہ ہے کہ ایک بااختیار ادارہ کی طرف نکاح کے رشتے کو ختم کرنا:

The legal dissolution of a marriage by a court or other competent body.

نکاح صرف ایک مرد اور ایک عورت کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ نکاح قانون فطرت کا معاملہ ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت جب نکاح کے ذریعہ آپس میں رشتہ قائم کرتے ہیں تو وہ فطرت کے ایک قانون کو اپنے اوپر منطبق (apply) کرتے ہیں ۔ فطرت کے جو قوانین ہیں، وہ سب کے سب بلا استثنا زندگی کے محکم اصول پر قائم ہیں ۔ نکاح کا مطلب یہ ہے کہ ایک عورت اور ایک مرد باہمی طور پر ایک دوسرے کے پارٹنر بنیں، اور کاگ ڈھیل (cogwheel) کی مانند ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہوئے خالق کے نقشۂ تخلیق (creation plan) کی تکمیل کریں۔

اس اعتبار سے طلاق خالق کے نقشۂ تخلیق کا حصہ نہیں۔ وہ انسان کے غلط استعمال آزادی (misuse of freedom) کا حصہ ہے۔

طلاق کسی انسان کے لیے ایک جذباتی ظاہرہ (emotional phenomenon) ہے۔ وہ انسان کی حقیقی ضرورت (real need) کا حصہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلاق کا ایک ٹائم باؤنڈ منضبط طریقے (prescribed method) مقرر کیا گیا ہے، جو تین مہینہ کے پراسس میں مکمل ہوتا ہے۔ جذباتی ارادہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے۔ اس لیے طلاق کا ایک طویل کورس بنادیا گیا ہے۔ تاکہ آدمی اپنے ارادے پر از سرِ نو غور (rethinking) کرے، اور جذباتی فیصلہ کے بجائے سوچے سمجھے فیصلہ کو اختیار کرے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ طلاق کا ارادہ ایک جذباتی ارادہ ہے۔ آدمی کو اگر سوچنے کا وقفہ دیا جائے تو زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ اپنی رائے پر نظر ثانی کرے گا، اور نکاح کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کرے گا۔

میں ذاتی طور پر ایسے واقعات کو جانتا ہوں جب کہ ایک انسان نے نکاح کے بعد جذباتی طور پر طلاق کا ارادہ کیا۔ لیکن ایسے اسباب پیش آئے کہ وہ فوری طور پر طلاق نہ دے سکا، بلکہ اپنے ارادے پر بالقصد یا حالات کے دباؤ کے تحت نظر ثانی کی۔ اس کے بعد اس کا ارادہ بدلا، اور اس نے منکوحہ عورت کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نتیجہ حیرت انگیز تھا۔ وہ یہ کہ مرد نے عورت کی خصوصیات کو دوبارہ دریافت (rediscover) کیا، اور پھر ان خصوصیات کو استعمال (utilize) کیا۔ اس کے بعد دونوں کاگ ڈھیل (cogwheel) کی طرح مل کر کام کرنے لگے، اور انہوں نے غیر متوقع طور پر بڑی کامیابی حاصل کی۔

اصل یہ ہے کہ لوگ عام طور پر شادی شدہ عورت کو اپنے لیے صرف ہوم پارٹنر (home partner) سمجھتے ہیں۔ حالانکہ فطرت کے قانون کے مطابق، عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لئے لائف پارٹنرز ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے فطرت کی طرف سے دیے ہوئے انٹلکچول پارٹنر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں، اور دونوں مل کر ایک دوسرے کے لیے تکملہ (counterpart) بن جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایک طرف قرآن میں طلاق کا ایک مقررہ طریقہ (prescribed course) ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ۖ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ (سورۃ البقرۃ:229)

"یعنی طلاق دوبار ہے، پھر یا تو قاعدہ کے مطابق رکھ لینا ہے یا خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دینا۔"

دوسری طرف حدیث میں طلاق کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں:

«أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللَّهِ الطَّلَاقُ»

"یعنی خالق کے نزدیک طلاق انتہائی حد تک ایک غیر مطلوب چیز ہے۔" (سنن ابن ماجہ:2018)

لیکن اگر کوئی شخص طلاق پر اصرار کرے تو اس کو چاہیے کہ وہ مقرر کورس کے مطابق ان تین مہینوں تک جذبات سے کام لینے کے بجائے خوب سوچے، اور پھر تیسرے مہینے میں عدت کے اختتام پر طلاق کی تکمیل کرے۔ ایسا انسان کو یہ موقع دینے کے لیے کیا گیا کہ وہ آخری حد تک سوچے، اور طلاق صرف اس وقت دے، جب کہ طلاق اس کے لیے سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت ایک ناگزیر ضرورت بن جائے۔ فطرت کے مطابق ، نہ کہ خواہش کے مطابق، اس کے لیے کوئی دوسرا آپشن سرے سے موجود ہی نہ ہو۔

موجودہ زمانے میں طلاق کو لے کر ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ہے تین طلاق کا مسئلہ۔

تین طلاق کا طریقہ بدعت کا طریقہ ہے جو بعد کے زمانے میں پیدا ہوا۔ ابتدائی دور کا مسلم معاشرہ اس مبتدعانہ طریقہ سے پاک تھا۔ تین طلاق کا مسئلہ کیسے

پیدا ہوا۔

اس معاملے میں سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

أَنَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ، طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً، فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرٍ قَدْ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَنَاةٌ، فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ، فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ (صحیح مسلم:1472)

اس معاملے میں دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

وَكَانَ عُمَرُ بنُ الخطّابِ رضيَ اللّٰهُ عنهُ إذا أتى برجلٍ طلَّقَ امرأتَهُ ثلاثًا أوجعَ ظَهْرَهُ (سنن سعید بن منصور:1073)

یعنی سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ طلاق کا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی 2 سالوں میں یہ تھا کہ تین طلاق ایک تھی۔ تو سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ لوگ اس معاملہ میں جلد بازی سے کام لے رہے ہیں، جس میں ان کے لیے جلد بازی نہیں تھی، تو میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کے لیے ایک حکم جاری کر دوں۔ چنانچہ انہوں نے حکم جاری کیا۔

دوسری روایت کے مطابق، اس حکم کا ایک جز یہ بھی تھا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب ایسا آدمی لایا جاتا جس نے اپنی عورت کو (بیک وقت) تین طلاق دی ہو تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس کی پیٹھ پر کوڑے مارتے تھے۔

خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین واقع کرنے کا جو عمل کیا، اس کی حیثیت حکم حاکم (executive order) کی تھی۔ اس کی حیثیت شریعت میں کسی تبدیلی کی نہ تھی۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ حکم حاکم ہمیشہ وقتی ہوتا ہے۔ وہ محدود زمانے کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ اللہ کے حکم کی طرح قیامت تک کے لیے ایک ابدی حکم، لیکن بعد کے علما نے حاکم کے اجتہادی حکم کو عملاً امر شرعی کا درجہ دے دیا۔ وہ خلیفہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اسی عمل پر فتوی دینے لگے، جب کہ خلیفہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ بعد کے علما کو یہ حق نہ تھا کہ وہ خلیفہ کے حکم کو شرعی حکم کی طرح عام حکم کر دیں۔ اسی لئے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم کو عام کرنے کے باوجود ان کے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ خطاکار کے پیٹھ پر کوڑے ماریں، اور اس کے بعد تین طلاق کو شرعی طور پر واقع کرنے کا فتوی دیں۔ کیوں کہ کوڑے مارنے کا حق مسلمہ طور پر صرف حاکم کو ہے، کسی اور کو ہرگز نہیں۔ جب علما کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خطاکار کو کوڑے

ماریں تو ان کو یہ بھی حق نہیں تھا کہ وہ خلیفہ کے حکم کو عام کر دیں، اور عام کر کے تین طلاق کو واقع کرنے کا طریقہ اختیار کریں۔ بعد کے علما کا یہی وہ اجتہادی طریقہ ہے جس سے تین طلاق (triple talaq) کا موجودہ مسئلہ پیدا ہوا۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (661-728ھ) نے علما کی اس غلطی کو جانا اور انہوں نے اس کے خلاف فتوی دیا۔ انہوں نے کہا:

" إن طلقها ثلاثا فی طهر واحد بكلمة واحدة أو كلمات...أنه محرم ولا يلزم منه إلا طلقة واحدة.. فإن كل طلاق شرعه الله فی القرآن فی المدخول بها إنما هو الطلاق الرجعي، لم يشرع الله لأحد أن يطلق الثلاث جميعا." (مجموع الفتاوی:33/8-9)

”یعنی اگر کسی نے ایک طہر میں تین طلاق دی، ایک ہی کلمہ میں یا ایک سے زیاد کلمات میں ..... تو یہ حرام ہے، اور اس سے صرف ایک طلاق لازم آتی ہے۔۔۔ کیونکہ ہر وہ طلاق جس کو اللہ نے قرآن میں مدخول بہا کے لیے مشروع کیا ہے، وہ طلاق رجعی ہے، اللہ نے کسی کے لیے ایک ساتھ تین طلاق کو مشروع نہیں کیا۔“

مگر امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سلفی علما کے سوا دوسرے علما نے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس فتوی کو عملاً تسلیم نہیں کیا۔ وہ بدستور اپنی سابق روش پر قائم رہے۔ اس معاملے میں بعد کے علم کی روش ایک غلط فہمی پر قائم تھی۔ انہوں نے غلط طور پر قدیم علما کی روش کو اجماعِ امت کا مسئلہ بنا لیا۔ حالانکہ ہرگز وہ اجماع امت کا مسئلہ نہ تھا۔ یہ بلاشبہ ایک غلطی کا معاملہ تھا۔ خلیفہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد آنے والے علما نے یہ غلطی کی کہ انہوں نے حکمِ حاکم (executive order) کو امر شرعی کا درجہ دے دیا۔ مزید غلطی یہ ہوئی کہ غلط فہمی پر مبنی علما کے اس عمل کو اجماع امت کا درجہ دے دیا گیا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ تھا۔ یعنی پہلے مرحلہ میں حکم حاکم کو امر شرعی کا درجہ دینا اور پھر غلط فہمی پر مبنی علما کے اس عمل کو اجماعِ امت سمجھ لینا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں صحیح موقف کیا ہے۔ صحیح موقف یہ ہے کہ اس معاملے میں ماضی کی غلطی کی تصحیح کی جائے، اور وہ یہ ہے کہ خلیفہ کے عمل کو حکم حاکم (executive order) کا درجہ دیا جائے، نہ کہ حکم شریعت کا درجہ۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعد کے علما نے جب خلیفہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کی بنیاد پر فتوی دینا شروع کر دیا تو فتوی ناقص فتویٰ کی حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ ان علما نے طلاقِ ثلاثہ کو واقع کرنے کا فتویٰ تو دیا، جب کہ اس کے لازمی جزء، یعنی کوڑا مارنے کو چھوڑ دیا۔ اس طرح اس مسلک کی کوئی بنیاد نہ تھی۔ یہ مسلک نہ تو ابتدائی دور پر قائم تھا اور خلیفہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مسلک پر۔ اس کا جواز تو دور اول کے عمل پر قائم تھا، اور خلیفہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے حکم حاکم کے عمل پر۔

اب ضرورت ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ کو اس معاملے میں دوسرے علما بھی درست مسلک کے طور پر اختیار کر لیں، جس طرح سلفی علما نے اس کو اختیار کر لیا ہے۔ یعنی طلاقِ ثلاثہ کو غضب پر محمول کرنا، اور اس کو ایک طلاق کا درجہ دینا۔

☆ہمارے دارالعلوم موجودہ حالات میں صرف اس بات کا ذریعہ بن گئے ہیں کہ اپنے مخصوص فقہی مسلک کو قرآن وسنت کے مطابق ثابت کر دکھائیں۔ 1330ھ میں رشید رضا مصری ہندوستان آئے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ دار العلوم دیوبند بھی گئے۔ وہاں ان کے خیر مقدم کے لئے ایک جلسہ ہوا۔ اس موقع پر موصوف نے دار العلوم کے ایک استاد سے پوچھا کہ یہاں حدیث کے درس کا کیا طریقہ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جب حدیث پڑھائی جاتی ہے تو محدث پہلے اس کے علمی نکات بیان کرتا ہے۔ اگر بادی الرائے میں حدیث امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے مسلک کے خلاف ہوتی ہے تو محدث حنفی مسلک سے اس کی مطابقت ثابت کرتا ہے۔ رشید رضا نے یہ سن کر کہا، کیا یہی تمام احادیث میں ہوتا ہے۔ کہا گیا ہاں، انہیں یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی۔ مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ (1908-1977ء) کی روایت کے مطابق (نفحۃ العنبر:ص71) انہوں نے کہ

أهل الحديث حنفي ، وكيف يمكن ذلك وهل هذا إلا عصبية مالها من سلطان

"کیا حدیث بھی حنفی ہے۔ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ تو محض عصبیت ہے جس کے لئے کوئی دلیل نہیں۔"

مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ اس زمانہ میں حدیث کے استاد تھے۔ انہیں یہ خبر پہنچی تو انہوں نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اسی کو اپنا موضوع بنایا اور ثابت کر دیا کہ تمام حدیثیں فقہ حنفی کے مطابق ہیں (یہ نہیں کہ فقہ حدیث کے مطابق ہے، بلکہ حدیث کو فقہ کے مطابق بتایا۔ یعنی اصل چیز فقہ ہے، حدیث تو ثانوی چیز ہے۔) تاہم جناب انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ کو (1875ء-1934ء) کو آخر عمر میں اس طریق تعلیم کی خامی کا احساس ہو گیا تھا۔ موصوف کے شاگرد مولانا مفتی شفیع رحمۃ اللہ (1897ء-1976ء) ناقل ہیں کہ مولانا کاشمیری رحمۃ اللہ نے ان سے کہا:

ہماری تمام کدو کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح کو قائم کریں مگر کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب محتمل الخطا ثابت کریں اور دوسرے مسلک کو خطا محتمل الصواب کہیں۔ ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو۔ اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ وہ صواب ہو۔ قبر میں منکر نکیر یہ نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا۔ آمین بالجہر حق تھی یا بالسرّ حق تھی۔ جس چیز کو نہ دنیا میں نکھرنا ہے نہ محشر میں۔ اس کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی۔

(وحدت امت:ص20)

اجارہ فاسد

اس فقہی مسئلے پر ایک مرتبہ ہند کے احناف میں باہمی فتوی بازی اور چیلنج بازی بھی ہوئی۔ ہوا یوں کہ ایک طوائف کی کمائی سے برف کی کل تیار ہوئی۔ اس کے خریدنے کو جناب عبد العزیز بن عبد القادر لدھیانوی نے ناجائز قرار دیا۔ جناب غلام رسول امرتسری اور جناب رشید گنگوہی نے اس کے خلاف فتوی دیئے۔ طوائف نے عدالت میں توہین کا دعویٰ کیا اور جناب غلام رسول اور جناب گنگوہی کے فتوے اپنی تائید میں پیش کئے۔ اس پر جناب محمد بن عبد القادر لدھیانوی نے لکھا:

جناب عبد العزیز لدھیانوی نے فریق مخالف کو کہلا بھیجا تھا کہ اگر کوئی اس فتوی مولوی غلام رسول امرتسری کو ثابت کر دے تو میں اپنی جائیداد جو آٹھ ہزار روپے کی ہے اس کو دے دوں گا۔ ورنہ خواجہ عبد الاحد و غلام محی الدین اپنی کل جائداد کو مساجد کی تعمیر میں خرچ کرنے کی نذر مان لیں۔ طرف ثانی کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اب بھی اگر کوئی تحقیق کے در پے ہو تو ہم اسی اقرار پر قائم ہیں، بشرطیکہ علمائے حرمین کا منصف ہونا مانا جائے اور ایک اقرار نامہ جانبین کی طرف سے تحریر ہو کر سرکار میں رجسٹری کرایا جائے تاکہ جانبین کو وقت آنے فیصلہ ثالثی کے موقع چوں چرا کا باقی نہ رہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ خرچی زنا کی جو بازاری عورتیں لوگوں سے مقرر کرکے لیتی ہیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے مذہب میں حلال طیب ہے جیسا کہ بحر الرائق شرح کنز و چلپی حاشیہ شرح وقایہ میں لکھا ہے:

قال وفي الاجارة الفاسد أجر المثل أي يجب أجره حتى ان ما أخذته الزانية إن كان بعقد ا لاجارة فحلال عند (الإمام) الأعظم لأن أجر المثل طيب و إن كان السبب حراماً و حرام عندهما وإن كان بغير عقد فحرام اتفا قاً - انتهى

ما فی الحلبی و فی المحبر و ان استجارها لیزنی بها لا بأس باخذه ولأنه فی اجارة فاسدة فیطیب له وإن كان السبب حراماً. انتھی

ملخصًا تو ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ ان عبارتوں سے خرچی کا روپیہ حلال طیب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ حاصل ان عبارات کا یہ ہے کہ اگر کسی عورت کو بطور اجرت سینے یا کاتنے پر مقرر کیا اور اس میں یہ بھی شرط کرلی کہ میں تیرے ساتھ زنا کروں گا تو ایسی صورت میں امام اعظم کے نزدیک اجر مثل کا دینا آتا ہے یعنی جس کام کے واسطے اس کو مقرر کیا تھا اس کام کی اجرت بطور رواج کے دینی پڑے گی کیونکہ یہ اجارہ اگرچہ جائز کاموں کے واسطے کیا گیا تھا لیکن بہ سبب شرط زنا کے فاسد ہو گیا اور اجارہ فاسدہ میں مزدوری رواجی اگر مزدوری مقررہ سے زیادہ نہ ہو دینی آتی ہے اسی بنا پر امام اعظم نے اجر مثل کو حلال طیب فرمایا۔(محمد لدھیانوی، فتاوی قادریہ:129-130)

قضاء قاضی

تقسیم ہند سے قبل احناف کے اخبار العدل گوجرانوالہ میں، فقہ حنفی بتامہا احادیث ہیں، کے عنوان سے جناب محمد یعقوب مدرس مدرسہ اسلامیہ مبارک پور کا ایک سلسلہ وار مضمون شائع ہوا۔ اس پر جناب منشی محمد عبد اللہ معمار نے اہل حدیث امر تسر 14 نومبر 1930ء میں چند سوالات کئے۔ جن کے جواب میں جناب محمد شریف کوٹلی ضلع سیالکوٹ اور جناب محمد یعقوب مذکور نے قلم اٹھایا۔ جناب محمد شریف نے لکھا:

مستری عبد اللہ معمار کی طرف سے اہل حدیث کے 14 نومبر کے پرچہ میں علماء احناف سے دو سوالات کئے گئے ہیں۔ ایک قاضی کی قضا (کوئی شخص کسی غیر منکوحہ عورت پر نکاح کا جھوٹا دعوی کر کے جھوٹی شہادت سے بقضاء قاضی اس کو لے لے تو اس سے ملاپ کرنا فقہ حنفیہ میں جائز لکھا ہے۔ اس کی طرف اشارہ ہے) کے ظاہر و باطن نافذ ہونے میں۔ اور دوسرا شراب انگوری کے سوا دوسری شرابوں کو بغرض قوت پی لینے کے جواز میں۔ آپ دریافت فرماتے ہیں کہ یہ دونوں مسئلے کس حدیث سے ماخوذ ہیں۔

میں (محمد شریف) کہتا ہوں یہ دونوں مسئلے اور نیز وہ باقی مسئلے جو ان کو یا ان کے ہم مشربوں کو کھٹکتے ہیں، ان سب کا جواب یہ ہے کہ

ائمہ محدثین نے تصریح کی ہے کہ امام اعظم کا کوئی قول ایسا نہیں جس کی سند آیت یا حدیث یا اثر یا حدیث ضعیف منجر بکثرت طرق یا قیاس صحیح نہ ہو۔

امام اعظم کے زمانہ میں جو احادیث کا ذخیرہ تھا وہ ائمہ کے سینوں میں محفوظ تھا۔ ان سب کا مجموعہ آج فقہ حنفیہ کی صورت میں ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ آج بالفرض اگر کوئی شخص دنیا میں ایسا ہو جس کی نظر میں تمام کتب احادیث مطبوعہ، غیر مطبوعہ تمام مسانید معاجم و صحاح و مراسیل گذری ہوں اور اس کو امام صاحب کے کسی ایک مسئلہ کی کوئی دلیل موجودہ کتب میں نہ ملی ہو تو بھی ہم اس مسئلہ کو بے دلیل نہیں سمجھ سکتے کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ذخیرہ 6 لاکھ حدیث اگر ہمارے سامنے ہوتی پھر اس میں امام اعظم کے مسائل کی دلیل نہ ملتی تو البتہ ہم کہہ سکتے تھے۔ مگر نہ تو وہ ذخیرہ حدیث موجود ہے جو قدماء کے سینوں میں تھا، نہ کسی عالم کی اس زمانہ میں اتنی وسیع نظر ہے کہ تمام موجودہ کتب حدیث پر اس کا عبور ہو۔ پھر اس وقت امام اعظم کے مسائل کی دلیل طلب کرنا مقلدین کو تکلیف مالا یطاق ہے (طاقت سے باہر)۔

لیکن پھر بھی علماء نے موجودہ کتب حدیث میں سے ہی حضرت امام کے مسائل کے دلائل کتب فقہ کی شروح و حواشی میں مفصل بیان فرمائے ہیں اور اردو خوان احباب کے لئے اردو میں بھی ایسے رسالہ جات لکھ دیئے جن کے مطالعہ سے ایسے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

(العدل، گوجرانوالہ، 3 دسمبر 1930: ص5)

مولانا ثناء اللہ فرماتے ہیں: یہ سوال کا جواب نہیں بلکہ عجز عن الجواب ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ کوٹلوی صاحب نے جن علماء کی کوششوں کا ذکر کیا ہے ان کی کتابوں سے وہ حدیث دکھا دیتے جس سے دونوں سوال حل ہو جاتے۔ ہم سے پوچھیں تو ہم بتا دیتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں کتاب الحیل لکھی ہے اس میں اس حنفی مسئلہ کا ذکر مع تردید کیا ہے اور تردید میں حدیث شریف نقل کی ہے۔

مولوی محمد یعقوب نے لکھا ہے:

روایت حدیث کے دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو بعینہ بغیر کسی تبدل و تغیر مع سند کے بیان کیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول یا فعل سے جو حکم معلوم ہو وہ بیان کیا جائے۔ پہلا طریقہ بہت سے دلائل قاہرہ و براہین قاطعہ کی وجہ سے غیر پسندیدہ تھا اسلئے حضرت امامنا الاعظم نے اس طریق سے روایت حدیث نہ فرمایا۔ روایت حدیث کا دوسرا طریقہ چونکہ محبوب و مرغوب تھا اس لئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس طریقہ سے بکثرت حدیثیں روایت کیں اور وہ روایات احناف کے پاس فقہ حنفی کی صورت میں موجود ہیں۔ (العدل 7 جنوری 1931ء ص7)

جناب ثناء اللہ امر تسری فرماتے ہیں:

مقسم اپنی تقسیم اقسام میں ہوتا ہے اور بولا جاتا ہے مثلاً انسان کی تقسیم یوں کریں کہ انسان عربی ہے اور عجمی تو انسان دونوں پر بولا جائے گا۔ صحت تقسیم کی علامت یہی ہے کہ مقسم اقسام پر صادق آئے۔ مگر محمد

یعقوب نے عجیب منطق ہمیں سنائی ہے گویا اس اصول کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ آپ کے نزدیک حدیث کے دو طریق ہوئے۔ ایک حدیث وہ جو بعینہ روایت ہو کر قول رسالت ہم کو ملے۔
دوسری حدیث وہ جو مسائل مستنبطہ کی شکل میں بصورت فقہ پہنچے۔ نتیجہ صاف ہے کہ مسائل فقہیہ کو بھی حدیث کہنا ہوگا۔
آپ کی پاس خاطر سے مسائل فقہیہ کو باصطلاح جدید حدیث نام رکھتے ہیں لیکن یہ جو آپ نے فرمایا ہے کہ دوسرا طریق یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل سے جو حکم معلوم ہو وہ بیان کیا جائے۔
اس میں آپ کو اعتراف ہے کہ مسائل فقہ احادیث سے ماخوذ ہیں۔
پس یہ دو مسائل متنازع بھی انہی میں سے ہیں۔ لہٰذا پھر وہی سوال لوٹے گا کہ
جس قول یا فعل سے یہ دو مسائل امام کو یا آپ کو صحیح معلوم ہوئے وہ قول رسول کہاں ہے؟
آپ عینی شرح بخاری۔ عینی شرح ہدایہ، مبسوط سرخسی۔ تخریج زیلعی وغیرہ دیکھ جائیے جہاں ملے وہ سامنے لاکر منشی عبد اللہ معمار سائل کو دے دیجئے۔
جناب محمد یعقوب پھر لکھتے ہیں:
آپ معمار صاحب علماء احناف سے پوچھتے ہیں کہ یہ دو مسئلے کس حدیث سے مستنبط و ماخوذ ہیں، بتلایا جائے:
1۔ قاضی کی قضا ظاہراً و باطناً نافذ ہوتی ہے۔
2۔ شراب انگوری کے سوا باقی شرابیں جو گڑ نارنگی وغیرہ کی بغرض قوت پی لینی جائز ہیں۔
جناب من! آپ کے سوالات تو بعینہ ایسے ہوئے جیسے کوئی کہے کہ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ جب امام ولا الضالین کہے تو مقتدیوں کو آمین کہنا چاہیے۔ جامع ترمذی میں آیا ہے کہ نماز میں تمام افعال کو حرام کر دینے والی چیز تکبیر تحریمہ ہے۔ لہٰذا بتلایا جائے کہ یہ مسئلہ کس حدیث سے ماخوذ ہے۔ آپ ہی انصاف سے فرمائیے کہ جواب دینے والا سوائے اس کے کیا کہے گا کہ
میاں سائل یہ کتابیں تو حدیث کی ہیں ان میں جتنے مسائل موجود ہیں وہ سب کے سب احادیث رسول ہیں پھر تم مجھ سے حدیث کا مطالبہ کیوں کرتے ہو۔ کیا حدیث کے لئے بھی حدیث کی ضرورت ہے۔ اگر اس قاعدے کو تسلیم کر لیا جائے تو ہر حدیث کے لئے ایک دوسری حدیث کی ضرورت ہے۔ علی ہذا القیاس اور اسی کا نام تسلسل ہے، وھو محال۔
(العدل گوجرانوالہ 7 جنوری 1931ء ص 7)
جناب ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ
بقول آپ کے اقوال فقہیہ پر دلیل طلب کرنا اور دلیل دینا محال ہے تو صاحب ہدایہ اور صاحب مبسوط وغیرہ کیوں مسائل فقہیہ پر دلائل حدیثیہ پیش کر کے محال کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جناب مرتضیٰ حسن چاندپوری نے تو فرمایا تھا کہ مسائل فقہیہ کو بادلیل جاننے والا غیر مقلد ہو جاتا ہے۔
(العدل 7 جون 1927ء)
اور یہ مولوی یعقوب فرماتے ہیں کہ
مسائل فقہیہ اور اقوال فقہاء پر دلیل دینا محال ہے۔
انکم لفی قول مختلف۔ اور اپنے سوال کا جواب سنیے۔
امام بخاری رحمہ اللہ اگر عنوان باب میں یہ کہتے کہ جب امام ولا الضالین کہے تو آمین کہنی چاہیے۔ تو ہم اس پر دلیل طلب کرتے۔ لیکن جب حدیث میں ہی یہ لفظ ہوں تو پھر یہی دلیل ہیں۔
(ہفت روزہ اہل حدیث امرتسر 30 جنوری 1931ء ص 3-5)

شبلی کا درس بخاری

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ دسمبر 1913ء کے آخر میں آخری سال کے لڑکوں نے مولانا (شبلی نعمانی) سے خواہش ظاہر کی کہ وہ انہیں صحیح بخاری کا درس دیں۔ مولانا نے اس کو قبول کیا اور ہر روز مغرب کے بعد درس شروع ہو گیا اور بہت سے لڑکوں نے اس میں شرکت کی لیکن ناظم صاحب (جناب احمد علی سہارنپوری محشی بخاری کے فرزند) نے اس کو پسند نہیں کیا۔ انہوں نے جناب مفتی محمد عبد اللہ صاحب ٹونکی سے جو، مہتمم و مدرس اعلیٰ تھے، خواہش کی کہ وہ طلباء کو اس سے روکیں۔
مفتی صاحب نے اس میں تامل کیا اور اس کا تذکرہ مولانا سے کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ
وہ آپ کو تحریری حکم بھیج دیں تو آپ اس پر عمل کیجئے، لیکن ناظم صاحب نے اس ناگوار فرض کی انجام دہی سے پہلو تہی کی اور مفتی صاحب کو مجبور کیا کہ وہی اپنے قلم سے حکم لکھیں۔ انہوں نے یہ کیا کہ
یہ تخصیص بخاری کے درس کے روکنے کے بجائے طلبہ کو خارج اوقات میں کسی سے درس لینے کی ممانعت کر دی اس کا اثر طلبہ پر بہت برا پڑا۔ بہت سے طلبا خارج اوقات میں دوسروں سے اپنے سابق کی کمی کو پورا کرتے تھے وہ سب بند ہو گئے۔
(حیات شبلی۔ ص۔ 654)

☆☆☆

جناب فُضیل بن عیاض رحمہ اللہ کہتے ہیں:
إذَا أَحبّ الله عَبْدًا أكْثَر غَمّه، وإذَا أبْغَض عَبْدًا وسّعَ عَلَيهِ دُنْياه.
"اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ مشکلات میں گھرا رہتا ہے اور جس پر اللہ مالک الملک ناراض ہو اُس پر دنیا فراخ کر دیتا ہے۔"
(سیر اعلام النبلاء: 4/338)

میرے دوست اور مولانا سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ کے داماد جناب محمد فاروق نسیم صاحب جو آج کل اپنی اہلیہ کے ساتھ ہند کے دورہ پر ہیں، ان کا انڈیا سے واٹساپ میسج پہنچا کہ آج 23 جنوری 2022ء کو بعد نماز مغرب ان کے سسر محترم حضرت مولانا عتیق الرحمن سنبھلی 96 سال کی عمر پاکر دہلی میں انتقال کر گئے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون، اَللّٰهُمَّ اغفر له وارحمه وأدخله الجنة الفردوس. آمین

برطانیہ میں مولانا سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ سے پچھلے 20 سال سے زائد عرصہ سے میرا تعلق تھا۔ لاتعداد مرتبہ ان سے میری ملاقات رہی۔ ذاتی طور پر مولانا مجھے جانتے تھے اور مجھے بہت عزیز بھی رکھتے تھے۔ مجلسوں میں کبھی نماز کا وقت ہو جاتا تو جماعت سے نماز پڑھتے اور امامت کرانے کا حکم مجھے دیتے۔ میں شدت سے انکار کرتا اور مولانا کی امامت میں نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کرتا تو فرماتے کہ آپ بہت اچھا قرآن پڑھتے تھے، میں آپ کی تلاوت کو سننا چاہتا ہوں کہ کر میرا حوصلہ بڑھاتے اور اصرار فرماتے: "الأمر فوق الأدب" کے تحت میں مولانا کے حکم کی تعمیل کرتا۔

مولانا سے ذاتی تعارف اور قربت کی ایک بنیادی وجہ ان کے داماد میرے قریبی دوست جناب محمد فاروق نسیم صاحب ہیں۔ جن کا تعلق جمشید پور انڈیا سے ہے۔ ان کے خانوادے کے کئی بچے اور بچیاں جامعہ محمدیہ اور کلیہ عائشہ صدیقہ منصورہ مالیگاؤں کے فارغ التحصیل ہیں۔ فاروق بھائی ایک اچھے شاعر بھی ہیں آپ کی شاعری میں بڑی معنویت ہوتی ہے۔ آپ برمنگھم کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے غالبا 30، 35 سال قبل انڈیا سے برلن، جرمنی تشریف لائے، لندن میں شادی ہوئی، خطبہ نکاح مولانا محمود احمد میرپوری رحمۃ اللہ علیہ ناظم عمومی مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ نے پڑھایا۔ پھر 1996ء میں آپ بچوں کو اسلامی اسکول میں داخلہ کی غرض سے جرمنی سے برمنگھم برطانیہ تشریف لے آئے اور برطانیہ ہی کے ہو کر رہ گئے۔ فاروق بھائی سے میری پہلی ملاقات 1996ء میں ہوئی تھی جو دھیرے دھیرے گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ ہمارا یہ تعلق گہرے فیملی فرینڈ شپ میں بدل گیا۔

فاروق بھائی کے گھر پر ہی عموماً مولانا سنبھلی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ اکٹھے کھانا کھاتے۔ مولانا کی مجلس میں رہ کر کئی کئی گھنٹہ استفادہ کا بھی موقعہ ملتا۔ مولانا کا قیام لندن میں تھا اور ان کی بیٹی اور داماد برمنگھم میں مقیم ہیں۔ مولانا سال میں کئی مرتبہ اپنی بیٹی داماد اور بچوں سے ملنے آتے رہتے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مولانا کا اپنی بیٹی اور داماد سے قلبی لگاؤ تھا۔ مولانا لندن سے برمنگھم عموماً کوچ سے آیا کرتے تھے۔ فاروق بھائی کی مصروفیت کی وجہ سے بسا اوقات مجھے مولانا کو برمنگھم کے بس اسٹیشن سے ریسیو کر کے ان کی صاحبزادی کے گھر پہنچانے کا بھی شرف ملتا رہا۔

مولانا ہند کے معروف و مشہور علمی گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ آپ حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ مولانا نعمانی کی وفات کے بعد آپ ہی اپنے خانوادہ کے سرپرست تھے۔ نہایت سادہ مزاج اور بہت ہی نرم و نازک تھے۔ بڑے دھیمے انداز میں گفتگو فرماتے تھے۔ ہمیشہ مسکرا کر بات کرتے تھے۔ آپ کو دیکھ کر لگتا تھا کہ آپ کسی دوسری دنیا کے باشندے ہیں۔ حنفی المسلک تھے قاسمی تھے دیوبند کا دفاع بھی کرتے تھے۔ لیکن آپ کے اندر میں نے توسع بھی دیکھا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی لخت جگر کا بیاہ ایک اہل حدیث گھرانے میں کیا۔ برطانیہ میں مولانا کے لاتعداد عقیدت مند ہیں انہی میں سے بعض حنفی علماء آپ سے استفسار کرتے کہ ایک حنفی عالم اور بڑے حنفی گھرانے سے ہوتے ہوئے بھی آپ نے ایک اہل حدیث کو کیوں اپنا داماد بنایا؟ یہ سوال آپ کو بہت ناگوار گذرتا تھا۔ آپ کے چہرے کے تاثرات سے لوگ اس کو تاڑ لیتے تھے۔ مولانا اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے تھے اس لئے ٹال جاتے تھے۔

مولانا از راہ ظرافت مسکرا کر اپنے اہل حدیث نواسہ عزیزم عمر سلمہ اور نواسی عزیزہ فردوس سلمہا سے کہتے کہ میرا انتقال ہو جائے گا تو میرے ایصال ثواب کے لئے آپ لوگ قرآن خوانی تو نہیں کریں گے کیونکہ آپ لوگوں کے مسلک میں یہ نہیں ہے۔ لیکن میرے لئے دعا ضرور کرنا۔ اپنی نواسی فردوس بیگم کا نکاح خود پڑھایا اور بڑی عمدہ نصیحتیں فرمائیں۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ آج سے بیس سال قبل مولانا کے اندر مسلک دیوبند کے تئیں جو تعصب اور سختی تھی وہ آخری عمر میں کافی حد تک نرم پڑ گئی تھی۔ بہت پہلے مولانا کے کچھ مضامین کا تتبع کرتے ہوئے شیخ عبد المعید مدنی علی گڑھ نے ماہنامہ اشاعت السنہ دہلی میں 40 صفحہ کا جواب لکھا جس کی فوٹو کاپی میں نے مولانا مرحوم تک پہنچائی۔ مولانا نے اس مضمون

کے پڑھنے کے بعد غالباً مسلکی بحثوں پر لکھنا بند کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ برمنگھم کی مسجد الہجرہ میں ایک سینئر اہل حدیث عالم دین نے خطبہ جمعہ دیا اور نماز پڑھائی۔ خطبہ مقررہ وقت سے بھی کچھ لمبا ہو گیا تھا لیکن نماز نہایت مختصر، بالکل چھوٹی سورتیں پڑھیں۔ مولانا سنبھلی نے معزز اہل حدیث خطیب کو سنت یاد دلائی کہ خطبہ مختصر ہونا چاہئے اور نماز قدرے طویل۔

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کے بڑے عرصہ تک مدیر رہے۔ پھر "محفل قرآن" تفسیر کا کالم لکھتے رہے۔ میں نے نوٹ کیا کہ آپ تفسیر لکھنے میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے بسا اوقات کسی آیت کے معنی و مفہوم کے مختلف گوشوں کو سمجھنے کے لئے موقعہ پانے پر مختلف علماء سے استفسار کرتے تھے، مولانا نے اس حقیر کو بھی کئی مرتبہ اس دشوار مرحلہ سے گذارا۔ تفسیر کے سوال پر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کئی مرتبہ مولانا سے میں نے بھی مختلف موضوعات پر سوالات کئے تھے۔ بڑی خندہ پیشانی سے جواب مرحمت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے سوال کیا کہ قرآن وحدیث میں مردوں کے لئے حوروں کا تذکرہ ہے لیکن عورتوں کے لئے ایسا کوئی ذکر موجود نہیں ہے تو فوری جواب دیا کہ عورتیں شرم وحیا کا پیکر ہوتی ہیں ان کے حق میں اس طرح کا تذکرہ غیر مناسب بات تھی۔ یہ بات ان کی عصمت وحشمت کے منافی تھی۔ ویسے اللہ تعالی نے عمومی طور پر یہ خوش خبری سنادی ہے جو مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں طور پر ہے:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيَ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ﴾ مولانا کی ایک کتاب "شہادت حسینؓ اور اس کا پس منظر" کافی مشہور ومقبول ہوئی۔ کتاب وسنت ڈاٹ کام ویب سائٹ پر اس کو پڑھا جاسکتا ہے۔ اسی ویب سائٹ پر اس کتاب کے تعارف میں تبصرہ نگار نے ذیل کی یہ چند سطور لکھی ہیں:

"نواسہ رسول ﷺ کی شہادت ایک عظیم سانحہ ہے جس کی مذمت بہر آئینہ ضروری ہے۔ لیکن اس بنیاد پر ماتم، سینہ کوبی اور سب وشتم کا بازار گرم کرنے کی بھی کسی طور تائید نہیں کی جاسکتی۔

زیر نظر کتاب میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے غیر جانبداری سے سانحہ کربلا پر بالدلائل اپنی قیمتی آراء کا اظہار کیا ہے اور اس کا مکمل پس منظر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مکمل کتاب 12 ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب شہادت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، خانہ جنگی، صلح حسین رضی اللہ عنہ پر ہے۔ ایک باب یزید کی ولی عہدی کی تجویز اور سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے عنوان سے ہے جس میں یزید کی ولی عہدی سے متعلق کھل کر بحث کی گئی ہے۔ باب دہم میں واقعہ کربلا کی مکمل سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ جبکہ اس سے اگلے باب میں شہادت کے بعد کی کہانی کو کسی لگی لپٹی کے بغیر بیان کیا گیا ہے۔ مولانا نے یزید پر سب وشتم کے مسئلہ کو بھی بڑے احسن انداز سے قلم زد کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ شہادت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ میں یزید کسی بھی حوالے سے ملوث نہیں تھے۔ فاضل مؤلف نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ سانحہ کربلا کے اسباب سے نقاب کشائی کرنے کے ساتھ ساتھ واقعات شہادت میں مبالغہ آمیزی کی بھی قلعی کھولی ہے۔ (ع۔م)"

اہل علم مولانا کی جملہ خدمات پر روشنی ڈالیں گے۔ اس وقت یہ چند کلمات فوری نوک قلم پر آگئے ہیں پھر کبھی موقعہ ملے تو تفصیل لکھی جائے گی۔ میں مولانا کے لئے اللہ کی رحمت اور مغفرت کی دعا کرتے ہوئے اللہ سے حسن ظن رکھتا ہوں کہ اللہ ارحم الراحمین مولانا کے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ فرمائیں گے، آپ کے تسامحات سے درگذر فرماکر جنت الفردوس میں جگہ عنایت کریں گے۔

ہم مولانا کی صاحبزادی جو میری اہلیہ کی گہری دوست ہیں، خوشی اور غم کی ساتھی ہیں، مثالی مہمان نواز ہیں ان کی اور ان کے شوہر میرے دوست جناب محمد فاروق نسیم صاحب اور مرحوم کے جملہ اہل خانہ کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالی ان سب کو صبر دے اور اس کا اجر دے اور ان کو والدین کے حق میں صدقہ جاریہ بنادے آمین۔

زیادہ افضل تلاوتِ قرآن یا ذکر

افاداتِ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

"اس بارے میں ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کے لحاظ سے مختلف کیفیت ہوتی ہے، اگر تو کوئی شخص قرآن کے مفاہیم ومعانی جانتا ہو، اس کے احکام وحکمتوں پر تدبر کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کے لیے تلاوتِ قرآن افضل ہے، کیوں کہ تلاوتِ قرآن، افضل ترین اذکار میں سے ہے، اور احکام الہی پر غور وفکر بہترین اعمال میں سے ہے اور اگر کوئی شخص کلام الہی کے فہم کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اس کے لیے کوئی دوسرا ذکر زیادہ افضل اور ذہنی بالیدگی وشفافیتِ قلب کا سبب ہے۔ البتہ قربتِ الٰہی کے راستے کے مسافر کو چاہیے کہ تلاوت و ذکر دونوں کو جمع کرے، جب ذکر کرتے ہوئے تھکاوٹ وسستی محسوس ہو تو ترتیل و تدبر سے قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دے، آیاتِ توحید پر تعظیم الٰہی کا جذبہ، آیاتِ وعد و امید پر دعا و التجاء، آیاتِ خوف و وعید پر پناہِ الٰہی اور آیاتِ قصص پر عبرت ونصیحت حاصل کرے۔

ہاں ذکر کرتے وقت ایک خاص چیز جسے محقق علماء نے ذکر کیا ہے اس کا ضرور دھیان رکھے کہ قرآن مجید میں وارد شدہ اذکار مثلاً: لا الہ إلا اللہ، کا ذکر کرتے وقت سورہ محمد کی آیت: فاعلم أنه لا إله إلا الله. کو بھی ذہن میں رکھے تاکہ تلاوت اور ذکر دونوں کی فضیلت کا مستحق بن جائے۔ (جامع المسائل: 3/384-385)